اپنے دکھ مجھے دے دو
راجندر سنگھ بیدی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اپنے دکھ مجھے دے دو

راجندر سنگھ بیدی

آلِ احمد سُرور کے نام

فہرست

لاجونتی

"ہتھ لائیاں کمھلاں نی لاجونتی دے بوٹے"

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری، ہاتھ بھی لگاؤ کملا جاتے ہیں)

ایک پنجابی گیت

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل

زخمی۔۔۔

گلی گلی، محلّے محلّے میں ''پھر بساؤ'' کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ ''کاروبار میں بساؤ''، ''زمیں پر بساؤ'' اور ''گھروں میں بساؤ'' پروگرام شروع کر دیا گیا تھا۔ لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا ''دل میں بساؤ'' اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوتی تھی۔

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلے ''ملّا شکور'' میں ایک کمیٹی قائم ہو گئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سیکریٹری چُن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلّے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لیے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام تھا بھی لاجو۔۔۔لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے۔ ”ہتھ لائیاں کمھلاں نی لاجونتی دے بوٹے۔“ تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا۔ جانے وہ کہاں ہو گی، کس حال میں ہو گی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہو گی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟ اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا۔ انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے، جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے، لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ

اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح، نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلا پن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی، ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا، جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجو نتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی، اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ

اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی، "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی۔" صاف پتہ چلتا تھا، وہ ایک دم ساری مار پیٹ بھول چکی ہے۔ گاوں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں، بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں۔ "لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا، عورت جس کے قابو میں نہیں آتی۔" اور یہ مار پیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگالی اور اس کا نام تھا سندر لال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولھا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا، "تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار۔ بیوی بھی چٹ پٹی ہو گی۔" لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا، مگر وہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدّے سے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے۔

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آئیں اور وہ یہی سوچتا۔ ایک بار صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں اور لوگوں کو بتادوں۔ ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوس ناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انہیں اپنا نہیں لیتا۔ ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انہیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا، جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا۔ انہیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیئے جو ان کے ساتھ ہوئیں۔ کیونکہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح۔۔۔ ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گے۔

گویا "دل میں بساؤ" پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلّہ ملّا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لیے

موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتّے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سُن کر صرف اتنا کہتے۔ او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنک مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا پروپیگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں، گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لے آنکھیں کھولتا اور ''دل میں بساؤ'' کے فریادی اور اندوہ گیں پروپیگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکّر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا، پر گُنگُناتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انہیں

دنوں، جب کہ مِس مردولا سارا بھائی، ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں، تو محلّہ ملّا شکور کے کچھ آدمی انہیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد" اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے۔ اور وہ نعرے لگاتے رہے، حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے۔

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں، باپ، بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفّت اور عصمت کو بچانے کے لیے انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان

دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی۔ سہاگ ونتی۔۔۔ سہاگ والی۔ اور اپنے بھائی کو اس جمِّ غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی۔ تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے۔ اور بہاری چلا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا، جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں، ان میں لاجو نہ تھی۔ سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دوچند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے، بلکہ شام

کو بھی جلوس نکالنے لگے، اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیک دان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈا سپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں۔ پھر کہیں نیکی رام، محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے۔ لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے، اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا، لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا۔ لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر، جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں، وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا۔ لیکن لوگ وہیں رو دیتے۔ اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے ایک پیڑ کے اردگرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوارامائن کا وہ حصّہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا۔ میں راجا رام چندر نہیں، جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسالے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی۔ ''کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے۔۔۔؟'' نارائن باوانے کہا۔ ''یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور اشلوک کا ورنن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے۔ سندرلال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا،

''ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیئے بابا۔''

”چپ رہو جی۔“

”تم کون ہوتے ہو؟“

”خاموش!“ مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا، ”مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔“

پھر ملی جلی آوازیں آئیں، ”خاموش“!

”ہم نہیں بولنے دیں گے۔“ اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی۔ ”مار دیں گے۔“

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔ ”تم شاستروں کی مان مریادا کو نہیں سمجھتے سندر لال۔“

سندر لال نے کہا۔ ”میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا۔ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے، لیکن سندر لال کی نہیں۔“

ان لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے، اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں، اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے۔ ”سنو، سنو، سنو۔۔۔“

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے۔ ”شری رام نیتا تھے ہمارے۔ پر یہ کیا بات ہے بابا جی! انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا، مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے؟“

نارائن بابا نے اپنی ڈاڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی۔ سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے۔“

”ہاں بابا“ سندر لال بابو نے کہا۔ ”اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے، جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا۔ آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے۔ اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ

بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور اَستیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی، جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا؟"

"آج ہماری سیتا نر دوش گھر سے نکال دی گئی ہے۔ سیتا۔ لاجونتی۔" اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھا لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کے چپکا دیے تھے اور پھر وہ سب "سندر لال بابو زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا۔ "مہاستی سیتا زندہ باد" ایک طرف سے آواز آئی، "شری رام چندر۔۔۔"

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں، "خاموش! خاموش!" اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے، جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد اور حکم سنگھ محرر چوکی کلاں، جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمیں پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے۔ اور ان

کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بڑی ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے۔

''ہتھ لائیاں کمھلاں نی لاجو نتی دے بوٹے''

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملاّ شکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کرب ناک سی انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا ''گرائیں'' لال چند، جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا آیا اور اپنی گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا، ''بدھائی ہو سندر لال۔''

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا، ''کس بات کی بدھائی لال چند؟''

''میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔''

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا، ”کہاں دیکھا ہے؟“ اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

”واہگہ کی سرحد پر۔“

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا، ”کوئی اور ہو گی۔“

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا، ”نہیں بھیّا، وہ لاجو ہی تھی، لاجو۔۔۔“

”تم اسے پہچانتے بھی ہو؟“ سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حُقّے پر سے اٹھالی اور بولا، ”بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟“

”ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے، دوسرا گال پر۔۔۔“

”ہاں ہاں ہاں“ اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا، ”تیسرا ماتھے پر“ وہ نہیں چاہتا تھا،

اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آ گئے، جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوا لیے تھے، جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کملانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی۔ اور گم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لُٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو۔ سندر لال کا سارا جسم ایک اَن جانے خوف، ایک اَن جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا، "لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟"

لال چند نے کہا، "ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔"

"پھر کیا ہوا؟" سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے

ہوئے بولا، ”سچ مچ آگئی ہے لاجونتی بھابی؟“

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ”واہگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں۔۔۔ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹئیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں، ان میں ادھیڑ، بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے۔ اس وقت ادھر کے والنٹیروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا، ”تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو۔ دیکھو۔ جتنی عورتیں تم نے دی ہیں، ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟ اور وہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندولے چھپا رہی تھی۔“

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا ”مال“ واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا، ”لاجو۔۔۔ لاجو بھابی۔“ مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی۔ اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا، جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں، زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منھ سے اتنا بھی نہیں نکلتا، ”پانی دے دو۔“ اسے یوں محسوس ہوا، بٹوارے سے پہلے بٹوارے کے بعد کا تشدّد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو۔ تو وہ جھٹ سے کہتا، ”مر گئے“ اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر، انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس

کے تینڈولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدّد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں ''گپتی'' کر لیتے۔ گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب ''گپتی'' کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا ''لین دین'' یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا، جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصّہ بیان کیا جاتا ہے۔ از بیک اَن گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے ارد گرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں۔ از بک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابلِ قبول عورت ایک اعترافِ شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے۔

سندر لال امر تسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا، لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے، لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا، کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی، اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بِتا کر آئی تھی، نہ جانے کیا کرے گا؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکّل مارے ہوئے تھی۔ عادتاً محض عادتاً۔۔۔ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیّاد کے دام سے

بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندر لال کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی
کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور
مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق۔ دائیں بُکّل اور بائیں بُکّل میں امتیاز کرنے
سے قاصر رہی تھی۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی،
ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی
بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں۔ وہ موٹی ہو گئی تھی۔ سندر لال
نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا، وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں
گھُل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہو گی اور آواز اس کے منھ سے
نکالے نہ نکلتی ہو گی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اسے
بڑا صدمہ ہوا، لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔
اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہند
سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا۔ لیکن ایک

چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم، محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے ''موٹی'' ہو گئی تھی اور ''صحت مند'' نظر آتی تھی، لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے۔''

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا، ''ہم نہیں لیتے مسلمران (مسلمان) کی جھوٹی عورت۔''

اور یہ آواز رسالو، نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گُم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلّاتی آواز آرہی تھی۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی حقیقت، اس نئی شدھی کا شدّت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید، کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصّے دار بنانا چاہتا ہے۔ ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھِرے ہوئے لاجو اور سندر

لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں، اور دوسری طرف انہیں اتنی لمبی اذیّت دیے جانے پر تاسف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شدّ و مد سے "دل میں بساؤ" پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا اور وہ لوگ جنہیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملّا شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروانہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آ چکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل کے مندر میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت

کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی، سندر لال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال، لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ وہ اسے کہتا تھا "دیوی!" اور لاجو ایک اَن جانی خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں۔ لیکن سندر لال، لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھُل جانے میں بھی ایک طرح سے سِمٹی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ "نہیں" "یونہیں" "اُوں ہوں" کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکاہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا۔ البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے "سیاہ دنوں" کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا۔

"کون تھا وہ؟"

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا، "جُماں" پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے

چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کر لیں اور سندر لال نے پوچھا، ”اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟“

”ہاں۔“

”مارتا تو نہیں تھا؟“

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا، ”نہیں۔“ اور پھر بولی، ”وہ مارتا نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی۔ اب تو نہ مارو گے؟“ سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا، ”نہیں دیوی! اب نہیں۔ نہیں ماروں گا۔۔۔“

”دیوی!“ لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی، لیکن سندر لال نے کہا،

”جانے دو بیتی باتیں۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے؟ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا، اپنی کرتا ہے۔“

اور لاجونتی کی من کی من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب ”دیوی“ کا بدن ہو چکا تھا لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش۔ لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی، جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لیے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی، بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی۔ وہ سندر لال کی، وہ پرانی لاجو ہو جانا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی۔ لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا

دیا جیسے وہ لاجونتی کانچ کی کوئی چیز ہے، جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی۔ اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے، پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اجڑ گئی۔ سندر لال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان۔ پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملّا شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

"ہتھ لائیاں کمھلاں نی، لاجونتی دے بوٹے۔۔۔"

جوگیا

نہادھوکر نیچے کے تین ساڑھے تین کپڑے پہنے۔ جوگیا روز کی طرح اس دن بھی الماری کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اور میں اپنے ہاں سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ ایسے میں دروازے کے ساتھ جو لگا تو چوں کی ایک بے سری آواز پیدا ہوئی۔ بڑے بھیا جو پاس ہی بیٹھے شیو بنا رہے تھے مڑکر بولے۔ کیا ہے جگل؟ کچھ نہیں موٹے بھیا۔ میں نے انہیں ٹالتے ہوئے کہا، ''گرمی بہت ہے'' اور میں پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ساڑھی کے سلسلے میں جوگیا آج کون سا رنگ چنتی ہے۔

میں جے جے سکول آف آرٹس میں پڑھتا تھا۔ رنگ میرے حواس پہ چھائے رہتے تھے۔ رنگ مجھے مرد عورتوں سے زیادہ ناطق معلوم ہوتے تھے۔ اور آج بھی ہوتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ لوگ بے معنی باتیں بھی کرتے ہیں لیکن رنگ کبھی معنی سے خالی بات نہیں کرتے۔

ہمارا مکان کالبا دیوی کی وادی شیٹ آگیاری لین میں تھا۔ پارسیوں کی آگیاری تو کہیں دور گلی کے موڑ پر تھی۔ یہاں پر صرف مکان تھے۔ آمنے سامنے اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ ان مکانوں کی ہم آغوشیں کہیں تو ماں بچے کے پیار کی طرح دھیمی دھیمی ملائم ملائم اور صاف ستھری تھیں اور کہیں مرد و عورت کی محبت کی طرح مجنونانہ سینہ بہ سینہ لب بہ لب، غلیظ اور مقدس۔۔۔

سامنے باپو گھر کی قسم کے کمروں میں جو کچھ ہوتا تھا۔ وہ ہمارے ہاں گیان بھون سے صاف دکھائی دیتا۔ ابھی بجور کی ماں ترکاری چھیل رہی ہے اور چاقو سے اپنا ہی ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ ڈنکر بھائی نے احمد آباد سے تل اور تیل کے دو پیپے منگوائے ہیں اور پنجابن سب کی نظریں بچا کر انڈوں کے چھلکے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک

رہی ہے جیسے ہمارے گیان بھون سے ان لوگوں کا کھایا پیا سب پتہ چلتا تھا۔ ایسے ہی انہیں بھی ہمارا سب اگیان نظر آتا ہو گا۔

جو گیا کے مکان کا نام تور نچھوڑ نواس تھا۔ لیکن میں اسے بانپو گھر کی قسم کا مکان اس لیے کہتا ہوں کہ اس میں عام طور پر بدھوائیں اور چھوڑی ہوئی عورتیں رہتی تھیں۔ جن میں سے ایک جو گیا کی ماں تھی جو دن بھر کسی درزی کے گھر میں سلائی کی مشین چلاتی اور اس سے اتنا پیسہ پیدا کر لیتی، جس سے اپنا پیٹ پال سکے اور ساتھ ہی اس کی تعلیم بھی مکمل کرے۔

جو گیا سترہ اٹھارہ برس کی ایک خوب صورت لڑکی تھی قد کوئی ایسا چھوٹا نہ تھا لیکن بدن کے بھرے پرے اور گھٹے ہونے کی وجہ سے اس پر چھوٹا ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ کسی کو یقین بھی نہ آسکتا تھا۔ کہ جو گیا دال، رنگنا اور ہفتے میں ایک آدھ بار کی شری کھنڈ سے اتنی تندرست ہو سکتی تھی۔ بہر حال ان لڑکیوں کا کچھ مت کہیے جو بھی کھاتی ہیں الم غلم، ان کے بدن کو لگتا ہے۔ جو گیا کا چہرہ سومنات مندر کے پیش رخ کی طرح چوڑا تھا۔ جس میں قندیلوں جیسی آنکھیں رات کے

اندھیرے میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو روشنی دکھاتی تھیں۔ مورتی جیسا ناک اور ہونٹ زمرد اور یاقوت کی طرح ٹنکے ہوئے تھے۔ سر کے بال کمر سے نیچے تک کی پیمائش کرتے تھے جنہیں وہ کبھی ڈھیلا ڈھیلا اور بھیگا بھیگا رکھتی اور کبھی اس قدر خشک بنا دیتی کہ ان کی کچھ لٹیں باقی بالوں سے خواہ مخواہ الگ ہو کر چہرے اور گردن پر مچلتی رہتیں۔ اس کا چہرہ کیا تھا پورا تارامنڈل تھا۔ جس میں چاند خیالوں اور جذبوں کے ساتھ گھٹتا اور بڑھتا رہتا تھا۔ جوگیا یوں بڑی بھولی تھی۔ لیکن اپنے آپ کو سجانے بنانے کے سلسلے میں بہت چالاک تھی۔ کب اور کس وقت کیا کرنا ہے۔ یہ وہی جانتی تھی اور اس کے اس جاننے میں اس کی تعلیم کا بڑا ہاتھ تھا، جس نے اس کے حسن کو دو بالا کر دیا تھا۔ گڑبڑ تھی تو بس رنگ کی۔ کیونکہ جوگیا کا رنگ ضرورت سے زیادہ گورا تھا۔ جسے دیکھتے ہی زکام کا سا احساس ہونے لگتا۔ اگر باقی کی چیزیں اتنی مناسب نہ ہوتیں تو بس چھٹی ہو گئی تھی۔

میں نہیں جانتا محبت کس چڑیا کا نام ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جوگیا کو دیکھتے ہی میرے اندر کوئی دیواریں سی گرنے لگتی تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے۔ جوگیا

بھی مجھے دیکھ کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتی، جو گیا میری بھتیجی ہیما کی سہیلی تھی

عجیب سہیل پنا تھا۔ کیونکہ ہیما صرف سات سال کی تھی اور جو گیا اٹھارہ برس

کی۔ ان کی دوستی کی کوئی وجہ تھی، جسے صرف جو گیا جانتی تھی اور یا پھر میں جانتا

تھا۔ موٹے بھیا اور بھابی صرف یہی سمجھتے تھے۔ وہ ہیما سے پیار کرتی ہے۔ اس

لیے اسے پڑھانے آتی ہے۔ یوں ہمارے گھر میں آکر جو گیا سب کو سبق دے

جاتی تھی۔ میں جو ایک آرٹسٹ بننے جا رہا تھا ایسی رکھ رکھاؤ کی باتوں کا قائل نہ

تھا۔ لیکن میری مجبوریاں تھیں، میں نے کمانا شروع نہیں کیا تھا اور میرے ہر قسم

کے خرچ کا مدار موٹے بھیا پر تھا۔ البتہ بیچ بیچ میں مجھے اس بات کا خیال آتا تھا۔

اس داؤ گھات میں بھی ایک مزہ ہے۔ مغرب میں لڑکے لڑکیاں جو اتنی آسانی

سے ایک دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، بنا کسی التہاب کے ایک

دوسرے کی آغوش میں چلے آتے ہیں، خاک لطف اٹھاتے ہیں؟ اتفاقاً محبوبہ کے

بدن سے چھو جانے پر ان کے اندر تو کوئی بجلی نہ دوڑتی ہو گی؟ شاید ان کو کوئی ایسا

لطف ملتا ہو جو ہمارے لطف سے ارفع ہو۔ لیکن ہمارے ہاں صرف لمس اور اِدھر

اُدھر کی باتوں ہی میں ایسے تلذّذ کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے وصال میں بھی کیا ہوگا؟ یوں ہی دو چار بار میرا ہاتھ جو گیا کے پنڈے کو لگ گیا ہوگا۔ ایک بار صرف ایک بار میں نے اپنے ارادے سے اس کا منہ چوما تھا۔

ہم گھر سے تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے کے ساتھ نکلتے تھے۔ اور پھر پارسیوں کی آگیاری کے پاس مل جاتے۔ ہمارے اس راز کو صرف وہ پارسی پجاری ہی جانتا تھا جو فرشتوں کے لباس میں اگیاری کے باہر ہی بیٹھا ہوتا اور منہ میں ژند اوستا پڑھتا رہتا۔ وہ صرف ہمارے سروش کو سمجھتا تھا۔ اس لیے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم اسے ضرور صاحب جی کہتے اور پھر اس راستے پہ چل دیتے جو دنیا کے لہو و لعب میٹرو سینما کی طرف جاتا تھا۔ جہاں پہنچ کر جو گیا اپنے کالج کی طرف چل دیتی اور میں اپنے سکول کی طرف۔ راستے بھر ہم غیر متعلق باتیں کرتے اور ان سے پورا حظ اٹھاتے۔ اگر پیار کی باتیں ہوتیں بھی تو کسی دوسرے کے پیار کی جن میں وہ مرد کو ہمیشہ بدمعاش کہتی اور پھر اس بات پہ کڑھتی بھی کہ اس کے بغیر بھی گزارہ نہیں۔ ایک دن جہانگیر آرٹ گیلری میں

کسی آرٹسٹ کی منفرد نمائش تھی اور پورے شہر بمبئی میں سے کوئی بھی اس بدنصیب کی تصویروں کو دیکھنے اور خریدنے نہ آیا تھا۔ صرف میں اور جو گیا پہنچے تھے اور وہ بھی تصویریں دیکھنے کی بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے محسوس کرنے کے لیے۔ پورے ہال میں ہمارے سوا کوئی بھی نہ تھا اور تین طرف سے رنگ ہمیں گھور رہے تھے۔ "جو ہو میں ایک صبح، کے نام ایک بڑی سی تصویر تھی۔ جس میں اوپر کے حصّے پر برش سے گہرے سرخ رنگ کو موٹے موٹے اور بھدے طریقے سے تھوپا اور پچارا گیا تھا۔ جس نے ہماری روحوں تک میں التہاب پیدا کر دیا۔ اس تصویر کے نیچے ایک اسٹول سا پڑا تھا۔ جس پر جو گیا کسی اندرونی تکان کے احساس سے بیٹھ گئی۔ اس کی سانس قدرے تیز تھی اور میں جانتا تھا۔ محبت میں ایک قدم بھی بعض وقت سینکڑوں فرسنگ ہوتا ہے اور آدمی چلنے سے پہلے تھک جاتا ہے۔

آرٹسٹ روہانسا ہو کر باہر چلا گیا تھا۔ دیکھنے کوئی آتا مرتا ہے یا نہیں۔ اپنی نفرت میں وہ ہماری محبت کو نہ دیکھ سکا تھا۔ جبھی ہم دونوں کے اکیلے ہونے نے پورے

ہال کو بھر دیا۔

اس دن میں نے جو گیا سے سب کہہ دینا چاہا۔ ہم دونوں ہی پیار کی ہیرا پھیریوں سے تنگ آ چکے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا، ٹھٹکا اور پھر اسٹول کے پاس جو گیا کے عین پیچھے کھڑا ہو گیا۔ میں کہہ بھی سکا تو اتنا "جو گیا! میں تمہیں ایک لطیفہ سناؤں۔"

"سامنے آ کے سناؤ" بولی۔

میں نے کہا "لطیفہ ہی ایسا ہے۔"

میری طرف دیکھے بغیر ہی اسے میرے حیص بیص کا اندازہ ہو رہا تھا اور مجھے پیچھے اس کے کانوں کی لوؤں سے اس کی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ آخر میں نے لطیفہ شروع کیا، "ایک بہت ہی ڈرپوک قسم کا پریمی تھا۔"

"ہوں" جو گیا کے سنبھلنے ہی سے اس کی دلچسپی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”وہ کسی طرح بھی اپنی پریمیکا کو اپنا پیار نہ جتا سکتا تھا۔“

اس پر جو گیا نے تین چوتھائی میں میرے طرف دیکھا۔

”تم لطیفہ سنا رہے ہو۔“

”ہاں“ میں نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے کہا۔

اور جو گیا پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، منتظر۔۔۔ ایک ایسا انتظار جو بہت ہی لمبا ہو گیا تھا جس میں لمحات کے شرارے، کسی بارود سے چھوٹ چھوٹ کر نکل رہے تھے۔ خلا میں پھٹ رہے تھے اور آخر معدومیت کا حصہ ہوتے جا رہے تھے۔ جبھی 'جوہو میں ایک صبح' میں لال رنگ کے بیچ سے سورج کی کرن نیچے سمندر کی سیاہیوں میں ڈولتی ہوئی کشتی پہ پڑی اور میں نے کہا، ”وہ لڑکی اپنے پریمی سے تنگ آ گئی۔ آخر اس نے سوچا۔ اس بیچارے میں تو ہمت ہی نہیں۔ کیوں نہ میں اسے کوئی ایسا موقع دوں۔ شاید۔۔۔ چنانچہ اس نے اپنے جنم دن پر لڑکے کو بلا لیا۔ لڑکا آپ ہی گلدستہ بھی لایا۔ جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کی پریمیکا نے کہا، ہائے۔

کتنا پیارا ہے یہ اُودے میں گلابی۔ گلابی میں سفید رنگ کے پھول۔"

"پھر؟" جوگیا کی بے صبری پیچھے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

"ان کے بدلے تو کوئی میرا منہ بھی چوم لے" پھر۔۔۔ لڑکی نے اپنا منہ تھوڑا آگے کر دیا، مگر۔۔۔ وہ لڑکا باہر جا رہا تھا دروازے کی طرف۔

"ہے بھگوان" اور جوگیا نے ہاتھ اپنے ماتھے پر مار لیا تھا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لڑکی بولی۔ کہاں جا رہے ہو لالی۔ جس پر لالی نے دروازے کے پاس مڑتے ہوئے کہا۔ اور پھول لینے۔"

اس سے پہلے کہ جوگیا ہنستی اور اس کا انتظار ابدیت پہ چھا جاتا میں نے اس کو چُوم لیا۔ وہ ہنس نہ سکتی تھی کیونکہ وہ خفا تھی اور خوش بھی محبت کے اس بے برگ و گیاہ سفر میں ایکا ایکی زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا چلا آیا تھا جسے بارش کے چھینٹوں نے ہرا کر دیا تھا۔ اس دن اگر ہم جوشیلے، گہرے رنگ کی تصویر کے نیچے کھڑے نہ ہوتے تو میں جوگیا کا منہ نہ چوم سکتا تھا۔

اس کے بعد آرٹ کا دلدادہ کوئی آدمی آیا اور اس نے بازو والی تصویر خرید لی۔ جس کا نام تھا ”کوئی کسی کا نہیں“ اور جس میں ایک عورت سر ہاتھوں میں دیے رو رہی تھی سب رنگوں میں اداسی تھی اور ایسے وقت میں اداسی کے رنگ خرید رہا تھا، جب کہ سب کھلتے ہوئے رنگ ہمارے تھے جیب میں ایک پائی نہ ہونے کے باوجود سب تصویریں ہماری تھیں، نمائش ہماری تھی جو گیا ایک عظیم تشفی کے احساس سے معمور باہر دروازے کے پاس پہنچ چکی تھی جہاں سے اس نے ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا مکا دکھایا، مُسکرائی اور دوڑ گئی۔

کچھ دیر یونہی ادھر ادھر رنگ اچھالنے کے بعد میں بھی باہر چلا آیا۔ دنیا کی سب چیزیں اس روز اجلی جلی دکھائی دے رہی تھی۔ لوگوں نے ایسے ہی رنگوں کے نام اودا، پیلا، کالا اور نیلا وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ کسی کو خیال بھی نہیں آیا، ایک رنگ ایسا بھی ہے جو ان کی جمع تفریق میں نہیں آتا اور جسے اجلا کہتے ہیں اور جس میں دھنک کے ساتوں رنگ چھپے ہوئے ہیں۔ میرا گلا تشکّر کے احساس سے رندا ہوا تھا، میں کسی کا شکریہ ادا کر رہا تھا؟ اسی ایک لمس سے جو گیا ہمیشہ کے لیے

میری ہو گئی تھی، میں جیسے اس کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی کے ساتھ بیاہ بھی کر لیتی جب بھی وہ میری تھی جس میں سچائی ہو ولولہ ہو بد نصیب شوہر کو کہاں ملتا ہے۔

تو گویا اس دن میں دیکھ رہا تھا کون سے رنگ کی ساڑھی جو گیا اپنی الماری سے نکالتی ہے اگر وہ مجھے میرے ہاں کے دروازے کے پیچھے دیکھ لیتی تو ضرور اشارے سے پوچھتی آج کون سی ساڑھی پہنوں اور اسی میں سارا مزہ کر کرا ہو جاتا، میں تو جاننا چاہتا تھا صبح سویرے نہا دھو کر جب کوئی سندری اپنی ساڑھیوں کے ڈھیر کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اس میں کون سی چیز ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ آج فلاں رنگ کی ساڑھی پہننی چاہیے۔ ان عورتوں کے سوچنے کا طریقہ بڑا پر اسرار ہے۔ پر پیچ۔ پھیر اتنا ہے اس میں کہ مرد اس کی تہہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا، سنا ہے چاند نہ صرف عورت کے خون بلکہ اس کے سوچ بچار پہ بھی اثر انداز ہوتا ہے لیکن چاند کا اپنا تو کوئی رنگ ہی نہیں، روشنی ہی نہیں۔ وہ تو سب سورج سے مُستعار لیتا ہے جبھی، جبھی ساڑھی پہننے سے پہلے عورت ہمیشہ

اپنے کسی سورج سے پوچھ لیتی ہے آج کون سی ساڑھی پہنوں۔

نہیں نہیں۔ اس کا اپنا رنگ ہے، اپنا فیصلہ پھر کسی کو کوئی مرد تھوڑا بتانے جاتا ہے پھر رات کا بھی تو ایک رنگ ہوتا ہے۔ اس کا اپنا رنگ۔ اس دن واقعی بہت گرمی تھی نیچے وادی شیٹ آ گیاری لین میں آتے جاتے لوگ ریت کے رنگ کی سڑک پر سے گزرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا موسم کی بھٹیارن دانے بھون رہی ہے جب کوئی پنجابی یا مارواڑی بڑا سا پگڑ باندھے گزرا تو اوپر سے بالکل مکئی کا دانہ معلوم ہوا جو بھٹی کی آنچ میں پھول کر سفید ہو جاتا ہے۔

یہاں گیان بھون سے مجھے صرف رنگ کے چھینٹے دکھائی دیئے وہ سب ساڑھیاں تھیں، جن میں سے ایک جوگیا اپنے لیے، میرے لیے ساری دنیا کے لیے چن رہی تھی۔ یونہی اس نے ایک بار میرے گھر کی طرف دیکھا شاید اس کی نگاہیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں لیکن میں نے تو کسی اوٹ کی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی جس سے میں تو ساری دنیا کو دیکھ سکتا تھا لیکن دنیا مجھے نہ دیکھ سکتی تھی، اس دن واقعی میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی، جب میں نے دیکھا جوگیا نے ہلکے نیلے رنگ کو چنا

ہے، ایسے گرمی میں یہی ٹھنڈا رنگ اچھا معلوم ہوتا ہے اگر میں ہوتا تو جوگیا کو یہی رنگ پہننے کا مشورہ دیتا، جبھی میں نے سوچا، میں نے بہت چھپنے کی کوشش کی ہے لیکن جوگیا نے اپنے من میں بلا کر مجھے پوچھ ہی لیا تھا، پھر وہی شروع کی جدائی اور آخر کا میل معلوم ہوتا تھا آگیاری تک یہ دنیا اور اس کے قانون ہیں اس کے بعد کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا۔

میں نے بڑھ کر جوگیا کے پاس پہنچتے ہوئے کہا، "آج تم نے بڑا پیارا رنگ چنا ہے جوگی۔"

"میں جانتی تھی تم اسے پسند کروں گے۔"

"تم کیسے جانتی تھیں؟"

"ہوں"۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "آج تمہیں چھونے ہاتھ لگانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔"

"کیا جی چاہتا ہے۔"

اس وقت ایک وکٹوریہ ہم دونوں کے بیچ میں آ گئی جسے نکلنے میں صدیاں لگیں۔ میری نگاہیں پھر جھیلوں میں تیرنے، چھینٹے اڑانے لگیں جب تک ہم پرنس سٹریٹ کا چوراہا پار کر کے میٹرو کے پاس آ چکے تھے، جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے تھے۔ میں نے کہا ''آج جی چاہتا ہے سر تمہارے پیروں پر رکھ دوں اور روؤں۔''

''روؤں؟ کیوں؟''

''شاستر کہتے ہیں آتما کے پاپ رونے ہی سے دھل سکتے ہیں۔''

''کون سا پاپ کیا ہے تمہاری آتما نے؟''

''ایسا پاپ جو میرا شریر نہ کر سکا۔''

ایسی باتوں کو عورتیں بالکل نہیں سمجھ سکتیں۔ اور پھر ضرورت سے زیادہ سمجھ جاتی ہیں، جو گیا نہ سمجھ سکی اپنا ہی کوئی بچار اس کے من میں چلا آیا تھا ''جانتے ہو میرا جی کیا چاہتا ہے۔''

"کیا، کیا۔ کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"چاہتا ہے۔" اور اس نے اپنے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی کی طرف شارہ کیا۔

"تمہیں اس میں چھپا کر امبروں پر اڑ جاؤں، جہاں سے نہ آپ ہی واپس آؤں نہ تمہیں آنے دوں۔" اور یہ کہتے ہوئے جوگیا نے ایک بار اوپر ہلکے نیلے رنگ کے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں سے وہ کبھی آئی تھی۔

میں کچھ دیر کے لیے وہیں تھم گیا اور ان خوش نصیبوں کے بارے میں سوچنے لگا جنہیں جوگیا ایسی سندریاں اپنے دامن میں چھپا کر امبروں پر لے گئی ہیں، جہاں سے وہ خود آئی ہیں اور نہ انہیں آنے دیا ہے۔ دیوتا بھی ان کے پاس سے گزرتے ہیں تو پھر ایک سرد آہ بھر کے چلے جاتے ہیں۔

مڑ کر دیکھا تو جوگیا جا چکی تھی۔

امبر تو کہاں، جوگیا مجھے تپتی ہوئی زمین اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کے ایک طرف یتیم اور لاوارث چھوڑ گئی تھی۔ جس کا احساس مجھے خاص دیر کے بعد ہوا۔ حدت سے

پھٹی ہوئی سڑک کی دراڑوں میں گھوڑا گاڑیوں کے بڑے بڑے پہیے پھنس رہے تھے اور ان کے ڈرائیور پیشانیوں پر سے پسینہ پونچھتے ادھر ادھر تبرّے سناتے آ جا رہے تھے۔ جبھی میں نے دیکھا خشک آب کی سی کوئی موج چلی آ رہی ہے، وہ کوئی اور جوان لڑکی تھی۔ لانبی اونچی کٹے ہوئے بال جو ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔

چند قدم اور آگے گیا تو ایک نہیں دو تین چار عورتیں ہلکے نیلے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے شاپنگ کرتی پھر رہی تھیں۔ یہ تجربہ مجھے پہلی بار نہیں ہوا تھا، اس سے پہلے بھی ایک بار کرافورڈ مارکیٹ کے علاقے میں آنے جانے والی سب عورتوں نے دھانی لباس پہن رکھا تھا فرق تھا تو صرف اتنا کہ کسی کی اوڑھنی دھانی تھی اور کسی کی ساری اسکرٹ بھی دھانی تھی اور میں سوچتا رہ گیا تھا سویرے جب یہ عورتیں نہا دھو کر بالوں کو چھانٹتی ہوئی، بناتی ہوئی کپڑوں کی الماری کے پاس پہنچتی ہیں تو ان میں کون سی بات کون سا ایسا جذبہ ہے جو انہیں بتا دیتا ہے کہ آج مولسری پہننا چاہیے۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ایک دن کوئی نارنجی رنگ استعمال

کرتی ہے تو پھر اس سے اس کی طبیعت اوب جاتی ہے۔ اور پھر اس کا ہاتھ اپنے آپ کیسے دوسرے رنگ کی طرف اٹھ جاتا ہے مثلاً سرسوں کا ساپیلا رنگ، چمپئی رنگ، گل اناری، کاسنی، فیروزی۔ لیکن وہ کون سا بے تار برقی کا عمل ہے جس سے وہ سب ایک دوسری کو بتا دیتی ہیں اور پھر ایکا ایکی پورا بازار، سنسار ایک ہی رنگ سے بھر جاتا ہے، شاید یہ موسم کی بات ہے۔ یا ویسے بھی چاند کی بادل کی۔ شاید کوئی مروجہ فیشن کسی ایکٹرس کا لباس ہے جو ان کے انتخاب میں دخل رکھتا ہے۔؟ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بعض وقت وہ رنگارنگ کپڑے بھی پہنتی ہے۔ اور کیا کچھ مرد کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیتی ہیں۔

اس دن سب کی ساڑھیاں ہلکے نیلے رنگ کی دیکھ کر میری آنکھوں کو یقین نہ آرہا تھا۔ سمجھ کا شمہ بھر بھی دماغ میں نہ گھس سکتا تھا، جب میں سکول پہنچا ایک کلاس ختم ہو چکی تھی اور لڑکے لڑکیاں باہر آرہے تھے۔ کچھ آکر کمپاؤنڈ میں گل مہر کے نیچے کھڑے ہو گئے ان میں سیکشی بھی تھی۔ اس کے اسکرٹ کا بھی رنگ ہلکا نیلا تھا۔

اگر ہیمنت میرا دوست وہاں نہ مل جاتا تو میں پاگل ہو جاتا۔ ہیمنت یوں تو خزاں کو کہتے ہیں لیکن وہ حقیقت میں واسنت تھا۔ بہار، جو اس پر ہمیشہ چھائی رہتی، دنیا بھر میں کہیں کسی جگہ بھی ایک ہی موسم نہیں رہتا اور نہ ایک رنگ رہتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی سی ہنسی اور تضحیک رہتی تھی۔ جس کے کارن ہم اسے کہا کرتے تھے سالے چاہے کتنا زور لگالے تو کبھی آرٹسٹ نہیں بن سکتا۔ کیا تجھ پہ گریبان پھاڑ کر باہر بھاگ جانے کی نوبت آئی ہے۔ بے بسی میں تشنجی ہاتھ تو نے ہوا میں پھیلائے ہیں اور اپنے بال نوچے ہیں۔ اچھا کیا تیرے بدن پہ ایکا ایکی لاکھوں ٹڈے رینگے ہیں۔ رات کے وقت اندھیرے میں چمگادڑ تجھ پر جھپٹے ہیں اور اپنا منہ تیری شہ رگ سے لگا کر تیرا خون چوسا ہے۔ کیا تو اس وقت بچوں کی طرح رویا ہے جب تیری تصویر انعامی مقابلے میں اوّل آئی ہو۔ کیا تجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ماں باپ ہوتے ہوئے بھی تو یتیم ہے اور دوست ایک ایک کر کے تجھے اندھے کنویں میں دھکیل کر چل دیئے ہیں۔ کیا تو نے جانا ہے جس منصور کو سولی پہ چڑھایا گیا تھا وہ تو تھا۔ تیرے چہرے پہ سیاہیاں چھٹی ہیں اور اس پر کے

خط اتنے سخت اور گھناؤنے اور طاقت ور ہوئے ہیں جتنے میکسیکو کے میورلز؟ جس سے متوحش ہو کر۔۔۔

آج پھر میں نے اسے بتایا شہر کی سب عورتیں ہلکا نیلا رنگ پہنے نکل آئی ہیں۔ ہیمنت نے اپنے دانت دکھا دیئے اور حسب معمول میرا مذاق اڑانے لگا وہ مجھے ساون کا اندھا سمجھتا تھا، جسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے میں نے سیکشی کی طرف اشارہ کیا، جسے ہم ماڈل کہا کرتے تھے، وہ آج تک کسی کی ماڈل نہ بنی تھی میں نے کہا، ''دیکھو! آج یہ بھی نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے ہوئے ہے۔''

ہیمنت نے کچھ نہ کہا، میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لان پہ لے آیا جو پام کے پیڑوں سے پٹا پڑا تھا، وہاں ایک کنارے پہ پہنچ کر وہ باڑھ کے پیچھے کھڑا ہو گیا جہاں سے سامنے سڑک دکھائی دیتی تھی۔ ایک راستہ کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا وکٹوریہ ٹرمینس اور ہارن بائی روڈ کی طرف۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہ سب میرا وہم ہے۔ وہاں پہنچے تو کوئی عورت ہی نہ تھی۔ اگر عورتیں اپنے مردوں کو ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھیوں میں چھپا کر اوپر امبروں پہ اڑ گئی ہوتیں تو وہاں مرد

نظر نہ آتے۔ لیکن چاروں طرف مرد ہی مرد تھے اور وہ گھوم پھر رہے تھے۔ جیسے کبھی کسی عورت سے انہیں سروکار ہی نہ تھا۔ کوئی لانبا تھا کوئی ناٹا۔ کوئی خوبصورت اور کوئی بد صورت اور توندیلا۔ اور سب بھاگ رہے تھے جیسے انہیں کسی عورت کو جواب نہیں دینا ہے۔ جبھی ادھر سے لوہے کی بنی ہوئی گاٹن گزری جس نے ہرے رنگ کا کانٹا لگا رکھا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہیمنت بولا، ''پہچان اپنی ماں کو۔۔۔''

''میں نے بیکار کی عذر داری کی، میں ان بے چاری غریب عورتوں کی بات نہیں کرتا۔''

''کن کی کرتے ہو۔''

''ان کی جن کے پاس کپڑے تو ہوں۔''

جبھی میری بد قسمتی سے ایک سیڈان سامنے پارسی دارو والے کے ہاں رکی۔ اس میں ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اسی جماعت کی نمائندہ تھی جس کے

پاس نہ صرف کپڑے ہوتے ہیں بلکہ بے شمار ہوتے ہیں، اور رنگ اتنی انواع کے کہ وہ بوکھلا جاتی ہیں۔ اس لئے جب وہ اپنی وارڈروب کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں تو انہیں سندریوں کا وہ بے تار برقی پیغام نہیں آتا۔ ان کی حالت اس خریدار کی طرح ہوتی ہے جس کے سامنے کوئی دوکان دار انواع واقسام کا ڈھیر لگادے اور وہ ان میں سے کچھ بھی نہ چن سکیں۔

وہ عورت خوب لپی پتی ہوئی تھی۔ اور اس نے ایک شعلہ رنگ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پچاس فٹ چوڑی سڑک کے اس پار مجھے اس کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی۔ لیکن اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ باہر آگ برس رہی ہے جس میں ایسا شعلے کا سارنگ نہ چلے گا۔ کتنا سوقیانہ تھا مذاق اس کا۔

ایسے ہی میں ہیمنت کے سامنے کئی بار شرمندہ ہوا۔ ایک آدھ بار مجھے اسے شرمسار کرنے کا موقع مل گیا جب کہ سب عورتیں سرمئی ساڑھیاں پہنے سڑک پر چلی آئی تھیں۔ مجھے ہمیشہ ان کے رنگ ایک سے لگتے تھے۔ لیکن جب ہیمنت میرا کان پکڑ کر مجھے باہر لاتا وہ سب الگ الگ دکھائی دینے لگتے۔ آخر میں نے

اسے اپنے دماغ کا واہمہ سمجھ کر ان باتوں کا خیال ہی چھوڑ دیا۔

لیکن وہ چھوٹتا کیسے؟ ایک دن جو گیا نے کالے بلاؤز اور خاکستری رنگ کی ساڑھی کا بے حد خوب صورت امتزاج پیدا کر رکھا تھا۔ اس دن سب عورتوں نے یہی کمبی نیشن کر رکھا تھا۔ فرق تھا تو اتنا تھا کہ کسی کا بلاؤز خاکستری تھا تو ساڑھی کالے رنگ کی تھی جس میں سنہرے کا ایک آدھ تار جھلملا رہا تھا۔

کئی موسم بدلے، خزاں گئی تو بہار آئی۔ یعنی جس قسم کی خزاں اور بہار بمبئی میں آ سکتی ہیں، اور پھر اس بہار میں ایک کاہش سی پیدا ہونی شروع ہوئی، ایک چبھن، تلخی کی ایک رمق چلی آئی جو محبت اور کامرانی کو غایت درجے گداز کر دیتی ہے اور جذبوں کی آنکھوں میں آنسو چلے آتے ہیں۔ پھر کہیں ہرا زیادہ ہرا ہو گیا، اس پر تازگی اور شگفتگی کی ایک لہر دوڑ گئی، جیسے بارش کے دو چھینٹوں کے بیچ سبک سی ہوا پانی پہ دوشالہ بُن دیتی ہے۔ پھر سمندر میں اس قدر زمرد گھلا کہ نیلم ہو گیا اور اس میں مچھلیوں کی چاندیاں چمکنے لگیں۔ آخر وہ چاندیاں تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو ماہی گیروں کے حوالے کرنے لگیں۔ پھر آسمان پہ صوت و تجلی کا ٹکراؤ ہوا۔

بادل گرجے، بجلی تڑپی اور یکا یک چھاجوں پانی پڑنے لگا۔ اس سلسلے میں جوگیا نے کئی نیلے، پیلے، کالے، اُودے، سردئی اور سرمئی، دھانی اور چمپئی رنگ بدلے۔ اسے کتنی جلدی تھی لڑکی سے عورت بن جانے کی۔ پھر عورت سے ماں بن جانے کی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی صحت مند لڑکی کے جب بچے ہوں گے تو جڑواں ہوں گے، بلکہ تین چار بھی ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں کیسے سنبھالوں گا!! اور اس خیال کے آتے ہی میں ہنسنے لگا۔

ان دنوں جوگیا اپنی بیمار ماں کے پیر پڑ کر اس سے لپ سٹک لگانے کی اجازت لے چکی تھی۔ ایک طرف زندگی دھیرے دھیرے بجھی جارہی تھی تو دوسری طرف لپک لپک کر کِھل رہی تھی۔ جوگیا نے لپ سٹک لگانے کی اجازت تو لے لی تھی، لیکن اتنی ساڑھیوں، اتنے رنگوں کے لئے اتنی لپ سٹک کہاں سے لاتی۔ میں نے ایک دن میکس فیکٹر کی لپ سٹک خرید کر تحفے میں جوگیا کو دی تو وہ کتنی خوش ہوئی جیسے میں نے کسی بہت بڑے راز کی کلید اس کے ہاتھ میں دے دی ہو۔ وہ بھول ہی گئی کہ میرے ساتھ گر گام کے ٹرام کے پھٹے پر کھڑی ہے۔ وہ مجھ سے لپٹ

گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد اس کی آنکھیں میلوں ہی اندر دھنس گئیں اور نمی سی باہر جھلکنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ جوگیا بے حد جذباتی لڑکی ہے، بھلا میرے سامنے اتنی ممنون دکھائی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن بات دوسری تھی۔ جس رنگ کی میں لپ سٹک لایا تھا، اس سے میچ کرتی ہوئی ساڑھی جوگیا کے پاس نہ تھی اور نہ خریدنے کے لیے پیسے تھے۔ میرے پاس بھی اتنے پیسے نہ تھے جن سے کوئی خوب صورت سی ساڑھی خرید کر سے دے سکتا۔ میں نے تو لپ سٹک کے پیسے بھی موٹے بھیا کی جیب سے چرائے تھے۔ یا بھابھی کے ساتھ اس عشق میں بٹورے تھے جس کا حق صرف دیور ہی کو پہنچتا ہے۔

برسات ختم ہوئی تو ایک تماشا ہوا۔ جوگیا نے گھر میں بڑوں کے وقت کے کچھ عقیق بیچ ڈالے، اور میری لپ سٹک کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ساڑھی خرید لی۔ اس بات کا مجھے کہاں پتہ چلتا؟ لیکن ہمارے گھر میں ایک مخبر تھی، جوگیا کی سہیلی، ہیما۔ جوگیا نے نارنجی سرخ رنگ کی ساڑھی پہنی اور جب ہم آگیاری پار لاقانونیت کے جنگل میں ملے تو میں نے جوگیا کو چھیڑا، "جانتی ہو جوگیا آج تم کیا

لگتی ہو؟"

"کیا لگتی ہوں؟"

"بیر بہوٹی۔ جو برسات ہوتے ہی نکل آتی ہے۔"

جوگیا کے دل میں کوئی شرارت آئی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "جانتے ہو، تم کون ہو؟"

اور اس کے بعد جوگیا اس قدر لال ہو کر بھاگ گئی کہ اس کے چہرے اور ساڑھی کے رنگ میں ذرا بھی فرق نہیں رہا۔ اس دن سب عورتوں نے نارنجی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اپنی آنکھوں کے جلوس کی تاب نہ لا کر میں نے پھر ہیمنت سے کہہ دیا۔ اب کے ہیمنت نے اکیلے نہیں، تین چار لڑکوں کو ساتھ لیا اور شاہراہِ عام پر میری بے عزتی کی۔ شاید مجھے اتنا بے عزتی کا احساس نہ ہوتا اگر سیکشی وہاں نہ آ جاتی۔ جو سفید نائیلون کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور اس میں تقریباً ننگی نظر آ رہی تھی۔ وہ روز بروز سچ مچ کا ماڈل ہوتی جا رہی تھی۔

جوگیا کو بیر بہوٹی بننے کی کتنی خواہش تھی، اس کا مجھے روح کی گہرائیوں تک سے اندازہ تھا، لیکن میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں سکول سے پاس ہو کر نکل جاؤں اور کوئی اچھی سی نوکری کر لوں یا تصویریں بنا کر مالا بارہل اور وارڈن روڈ کے جھوٹے دقیقہ شناسوں کو اونے پونے میں بیچ دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لئے وقت چاہئے تھا، جو میرے پاس تو بہت تھا، تھوڑا بہت جوگیا کے پاس بھی تھا، لیکن ماں کے پاس نہ تھا۔ محنت اور مشقت کی وجہ سے اسے کوئی کرم روگ لگ گیا تھا۔

میں اس انتظار میں تھا کہ ایک دن بھابھی اور موٹے بھیا سے کہہ دوں، لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ ہیما بانپو گھر میں جوگیا کے پیار دلار لیتی ہوئی ایکا ایکی اپنے گھر میں آ نکلتی اور دھڑ سے کہہ ڈالتی، ''کاکا کیوں نہیں تم جوگیا سے بیاہ کر لیتے؟''

اور میں ہمیشہ کہتا، 'دھت' یہ 'دھت' اگر میں ہی کہتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ کچھ دن بعد ہیما کی اس ٹائیں ٹائیں پر بھیا بھابھی نے اسے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ایک

دن تو بھابھی نے اس معصوم کو ایسا طمانچہ مارا کہ وہ الٹ کر دہلیز پر جا گری۔ اس دن میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس بارے میں دونوں گھروں میں کوئی بات ہوئی ہے۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ جوگیا اور بجور کی ماؤں اور پنجابن نے مل کر بھابھی کے ساتھ بات چلائی اور منہ کی کھائی۔ بانپو گھر کی عورتیں یوں ٹھیک تھیں۔ ان سے بات کر لینا، ان کے ساتھ چیزوں کا تبادلہ بھی درست تھا۔ ایک آدھ بار اشارے سے رام کرنا ٹھیک تھا۔ لیکن ان کے ساتھ رشتے ناطے کی بات چلانا کسی طرح بھی درست نہ تھا۔ پھر اور بھی بہت سی باتیں نکل آئیں جو ہمارے گجراتی گھروں کا وبال ان کا زہر، مٹی کا تیل اور کنواں ہوتی ہیں۔ جوگیا کی ماں لڑکی کو کچھ لمبا چوڑا دے دلا نہیں سکتی تھی۔ اسی لئے جب ہمارے گھروں میں کوئی لڑکی جوان ہوتی ہے تو کچھ لوگ اس کی طرف دیکھ کر کہتے ہیں "تیار ہو گئی مرنے کو۔" خیر دینے دلانے کی بات پر میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بھابھی اور گیان بھون کی عورتوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ جوگیا کا باپ کون تھا، کوئی کہتی وہ

مسلمان تھا۔ اور کوئی بڑھیا گواہی دیتی وہ ایک پرتگالی تھا جو بڑودے میں بڑے عرصے تک رہا تھا۔ جو بھی ہو، وہ سب باتیں تھیں۔ ایک بات جو تحقیق کے ساتھ مجھے پتہ چلی تھی وہ یہ تھی کہ جوگیا کی ماں منادور کے برہمن دیوان کی دوسری بیوی تھی جسے قانون نے نہ مانا۔ جوگیا اس دیوان کی لڑکی تھی۔ مگر لوگ جوگیا کی ماں ایک برہمن عورت کو دیوان صاحب کی رکھیل کہتے تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے جنہوں نے جوگیا کی ماں کے کچھ بھی پلے نہ پڑنے دیا اور وہ بمبئی چلی آئی۔ کچھ بھی تھا، اس میں جوگیا کا کیا قصور تھا۔ وہ تو اپنے باپ کی موت کے تین مہینے بعد پیدا ہوئی تھی اور شفقت کا منہ آج تک نہ دیکھا تھا۔ میں ان سب چیزوں کے خلاف جہاد کرنے، جوگیا کے ساتھ فٹ پاتھ پر رہنے کو تیار تھا۔ لیکن باقی سب نے مل کر جوگیا کی ماں کو اس قدر صدمہ پہنچایا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ جلدی جلدی جوگیا کا ہاتھ کسی گزارے والے مرد کے ہاتھ میں دے دے۔ میرے گھر والوں کی باتوں کے کارن وہ میری صورت سے بھی بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے مجھ

سے شادی کی بات بھی کی تو وہ کپڑوں پر تیل چھڑک کر جل مرے گی۔ جوگیا اب کالج نہ جاتی تھی۔ اور باپو گھر کے جوگیا والے فلیٹ کے کواڑ اکثر بند رہتے اور ہم تازہ ہوا کے جھونکے کے لئے ترس گئے تھے۔

ایک شام مجھ پر بہت کڑی آئی۔ سرِ شام ہی اندھیرے کے چمگادڑ کے بڑے بڑے پر مجھ غریب پر سمٹنے لگے تھے، کچھ دیر بعد یوں لگا جیسے کوئی میری شہ رگ پر اپنا منہ رکھے تیزی سے میری سانس چوس رہا ہے۔ جتنا میں اسے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں، اتنا ہی اس کے دانت میرے گلے میں گڑتے جا رہے ہیں۔ ان شاموں کا رنگ سیاہ بھی نہیں ہوتا اور سفید بھی نہیں ہوتا۔ ان کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے۔ حبس اور جانکاہی کا رنگ۔ اور جن لوگوں پر ایسی شامیں آتی ہیں، وہی جانتے ہیں کہ ایسے میں صرف محبوبہ اور ماں ہی ان کو بچا سکتی ہیں۔ میری ماں مر چکی تھی، اور جوگیا میری نہ ہو سکتی تھی۔

افوہ اتنی گھٹن، اتنی اداسی۔۔۔ اداسی کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔ میلا چھدرا چھدرا، جیسے منہ میں ریت کے بے شمار ذرّے۔ اور پھر اس میں ایک عفونت

ہوتی ہے جس سے متلی ہوتی بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی۔ آخر آدمی وہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سے احساس کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور رنگوں کی پہچان جاتی رہتی ہے۔

صبح اٹھا، تو میرا اس گھر، اس شہر، اس دنیا سے بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا۔ اگر جوگیا کی ماں نہ ہوتی اور وہ میرے سات چلنے پر راضی ہو جاتی تو میں اسے لے کر کہیں بھی نکل جاتا۔ جبھی مجھے بیراگی یاد آنے لگے، بودھ بھکشو یاد آنے لگے جو اس دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور کہیں سے بھی بھکشا لے کر اپنے پیٹ میں ڈال دیتے ہیں اور 'اوم منے پدمے ہم' کا ورد کرنے لگتے ہیں۔

میں واقعی اس دنیا کو چھوڑ دینا چاہتا تھا، لیکن سامنے بانپو گھر میں جوگیا کے فلیٹ کا دروازہ کھُلا، اور جوگیا مجھے سامنے نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راتوں سے نہیں سوئی۔ اس کے بال بے حد روکھے تھے اور یوں ہی ادھر ادھر چہرے اور گلے میں پڑے تھے۔ اس نے کنگھی اٹھائی اور بالوں میں کھبو دی۔ کچھ دیر بعد وہ الماری کے پاس جا پہنچی۔

میں اسکول کی طرف جا رہا تھا، راستے میں سب عورتوں نے جو گیا کپڑے پہن رکھے تھے۔ انہیں کس نے بتایا تھا؟ وہ اداس تھیں جیسے زندگی کی ماہیت جان لینے پر انہیں بھی کوئی بیراگ ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کھڑتال تھی اور ہونٹوں پر بھجن تھے۔ جو نہ کسی کو سنائی دے رہے تھے نہ دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بھکشو بنی ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر جا رہی تھیں، اور انہیں کھٹکھٹا رہی تھیں لیکن اس بھرے پرے شہر بمبئی میں کوئی بھی انہیں بھکشا دینے کے لئے باہر نہیں آ رہا تھا۔

اسکول پہنچا تو ہیمنت بدستور ہنس رہا تھا۔ آج اس نے پہل کی، بولا، ''شہر کی عورتوں نے آج کیا رنگ پہن رکھا ہے؟'' میں اس بے حس آدمی کو کوئی جواب نہ دینا چاہتا تھا لیکن اپنے آپ میرے منہ سے نکل گیا ''آج وہ سب جوگنیں بن گئی ہیں، سب نے بیراگ لے لیا ہے اور جو گیا پہن لیا ہے۔''

اس دن میں اسے اور سیکشی کو گل مہر کے نیچے سے، پام کے پیڑوں میں گھسیٹتا ہوا باڑ کے پاس لے گیا۔ سامنے سڑک چل رہی تھی اور اس پر انسان کے پتلے

ساکت تھے، ان سب نے بیراگ لے لیا تھا اور جوگیا کھتیاں پہنے بلا ارادہ، بے مقصد پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ جیسے اس دنیا میں کوئی مرد نہیں، کوئی عورت نہیں، جسے ان کو جواب دینا ہے۔ میں نے ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جوگیا کپڑے پہنے ہوئے ہاتھ میں کمنڈل لئے جا رہی تھی۔ ہیمنت کھکھلا کے ہنسا۔ ساتھ ہی سیکشی بھی ہنسی۔ اس نے جینز پہن رکھی تھی۔ وہ پورے طور پر ماڈل بن چکی تھی۔

جب ہیمنت کی ہنسی تھمی تو اس نے کہا، "تو بالکل پاگل ہو گیا ہے جگل، کہاں ہیں جوگیا کپڑے؟ اس عورت نے تو اُودے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی ہے اور وہ تجھے کمنڈل دکھائی دیتا ہے۔ پرس ہے خوبصورت سا۔" سیکشی نے بھی ہیمنت کی تائید کی۔ میں حواس باختہ کھڑا سامنے سڑک پر دیکھتا رہا۔ جبھی ایک بس آ کر رکی اور اس میں سے ایک لڑکی اتری۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے اپنے آپ سے کہا۔۔۔ وہ جوگن ہے۔ جوگیا کپڑے پہنے ہوئے۔ میں اندھا ہوں۔۔۔ لیکن اپنی آنکھوں پر یقین کرنے کے لئے میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے یقین ہو گیا

اور پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے آواز دی "ہیمنت" ان کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ مجھے ویسے ہی بے یار و مددگار اس صحرا میں چھوڑ گئے تھے جیسے لوگ کسی پاگل آدمی کو چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی ان کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے پتھر نہیں مارے تھے اور نہ مجھے اولیا کہا تھا۔

اور وہ لڑکی اس طرف آرہی تھی۔ اب تو مجھے پورے سنسار پہ پھیلے ہوئے رنگ کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں یقین اور ایمان کی آواز کے ساتھ ہیمنت اور سیکشی کو پکارتا، وہ میرے قریب آچکی تھی۔ میں نے ایک آواز سنی "بیر" اور میں نے چونک کر دیکھا۔ کسی دوسرے رنگ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ خود جوگیا تھی۔ جسے میں نے صبح اپنے گیان بھون سے باپو گھر کے کھلے دروازے سے سب ساڑھیوں میں سے جوگیا رنگ کی ساڑھی کا انتخاب کرتے دیکھا تھا۔

ایک عجیب بے اختیاری کے عالم میں میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اور عجیب بے بسی کے عالم میں رک گیا۔ جوگیا بولی، "میں کل بڑودہ جارہی ہوں۔"

”کیوں جوگیا، بڑودہ میں کیا ہے؟“

”میری ننھیال، وہاں میرا بیاہ ہو رہا ہے پرسوں۔“

”او۔۔۔“

”میں تم سے ملنے آئی تھی۔“

”تو ملو۔“ میں جانے کیا کہہ رہا تھا۔‘

اس وقت آرٹس اسکول کے کچھ لڑکے لڑکیاں، پرنسپل اور کچھ دوسرے لوگ آ رہے تھے۔ جب کہ جوگیا نے اچک کر اتنے زور سے میرا منہ چوم لیا کہ میں بوکھلا اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ وہ اٹھارہ انیس کی بجائے پینتیس چالیس سال کی بھرپور عورت بن گئی تھی۔ اگر کچھ لوگ دیکھ بھی رہے تھے تو وہ ہمیں دکھائی نہیں دیئے۔ وہ دیکھ بھی رہے تھے تو کیا کر سکتے تھے۔؟ جاتے ہوئے جوگیا نے کہا۔ ”میرے جانے کے بعد تم روئے تو میں ماروں گی۔ ہاں!“ اور ساتھ ہی اس نے مکا دکھا دیا۔ اور اس کے بعد جوگیا چلی گئی۔

سویرے گیان بھون اور باپنو گھر کے سامنے ایک وکٹوریہ کھڑی تھی۔ جس پر بازار کا بوجھ اٹھانے والے کچھ سوٹ کیس اور ٹرنک رکھ رہے تھے، کچھ یوں ہی ادھر ادھر کا سامان۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے باپنو گھر کے سب لوگ نیچے چلے آئے تھے، لیکن سامنے گیان بھون سے میرے سوا کوئی نہ آیا تھا۔ موٹے بھیا اور بھابھی تو کیا آتے۔ معصوم ہیما کو بھی انہوں نے غسل خانے میں بند کر دیا تھا۔ جہاں سے اس کے رونے کی آواز گلی میں آرہی تھی۔

پہلے بجور کی ماں اور پنجابن کے سہارے جوگیا کی ماں اتری اور گرتی پڑتی وکٹوریہ میں بیٹھ گئی۔ تھوڑا سانس درست کیا اور سب کی طرف ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی۔

"اچھا بہنو، ہم چلتے بھلے، تم بستے بھلے۔۔۔"

اور پھر آئی جوگیا۔ جوگیا نے ہلکے گلابی رنگ کی ایک خوب صورت ساڑھی پہن رکھی تھی اور گلاب کا ہی ایک پھول محنت اور خوبصورتی سے بنائے ہوئے جوڑے میں ٹانک رکھا تھا۔ ابھی وہ وکٹوریہ میں بیٹھی بھی نہ تھی کہ اگیاری کا پارسی پروہت ادھر آنکلا۔

میں نے عادتاً کہا۔

”صاحب جی“

”صاحب جی“ پارسی پروہت نے جواب دیا اور پھر مجھے اور جوگیا کو تقریباً ایک ساتھ کھڑا دیکھ کر مسکرایا۔ آشیر واد میں ہاتھ اٹھائے اور منہ میں ژند اوستا کا جاپ کرتا ہوا چلا گیا۔ جوگیا گاڑی میں بیٹھی تو اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔

جب میں بھی مسکرا دیا۔

ببّل

درباری لال، شام گھر ہی میں بیٹھا،سیتا کے ساتھ بیکار ہو رہا تھا۔ کسی کے ساتھ بیکار ہونا اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی دیکھنے میں ایوننگ نیوز یا غالب کی غزلیں پڑھ رہا ہو لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو۔

سیتا نے تو کہا تھا وہ ٹھیک چھ بجے اروراسنیما کی طرف سے آنے والی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہو گی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ کاسنی ہو گا، لیکن۔۔۔

درباری کنگز سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب مہیشوری ادیان ہو گیا ہے۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمدنی تو کوئی خاص نہیں تھی لیکن پیسے کی کمی بھی نہ تھی۔ باپ مہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فارورڈ ٹریڈنگ میں تین چار لاکھ روپے بنا لئے تھے اور پھر ایکا ایکی ہاتھ کھینچ لئے جو اب تک کھنچے ہوئے تھے۔ آج بھی کاٹن ایکسچینج میں ان کے ساتھی مہتا صاحب کے مکھن میں سے بال کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ہنس دیتے۔۔۔ ایسی ہنسی جو آدمی تین چار لاکھ روپیہ اندر ڈال کر ہی ہنس سکتا ہے!

پھر بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارواڑیوں کے گھر میں ہوئی تھی، جنھوں نے بیس سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈالے اور یوں اسے درباری کی بھابی بنایا۔ برس ایک بعد درباری کی اپنی بہن، ستونتی نار، ایک لکھ پتی اسماعیلی صالح محمد کے ساتھ بھاگ گئی اور نکاح کر لیا۔ گلی، محلے پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو پریم کٹیر۔۔۔ اپنے گھر میں گھسنے نہ دیا۔ آخر من منوتی ہو گئی۔ لڑکے کے رشتے دار کہتے تھے لڑکی کو مشرف بہ اسلام

کیا گیا ہے اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے اور مہتا صاحب کہتے تھے لڑکے کو شدھ
کرنے کے بعد اس کا نام سر داری موہن رکھا گیا ہے لیکن سر داری موہن یا صالح
محمد اپنا نام ہمیشہ ایس ایم نواب ہی لکھا کرتا۔ چونکہ لڑکے کی اس قبیح حرکت پر
غصہ نکالنے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لیے درباری لال کے حواری جب بھی
ستونتی نار کے پتی یا شوہر سے ملتے تو یہی کہتے، ”کیوں بے صالح۔۔۔؟“

آج صالح یا سر داری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دو بچے بھی۔ اس
سمے بہاری اور بھابی گن وتی نے مل کر درباری کی شادی کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ عورتیں
مثالی مرد اور مرد مثالی عورت کی باتیں کرتے کرتے آپس میں الجھنے لگے۔
درباری بر آمدے میں بیٹھا، اپنے بارے میں ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ایکا ایکی وہ لپکا
اور اپنے منہ کے لاؤڈ اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا، ”میں
درباری لال مہتا، ولد گردھاری لال مہتا، ساکن بمبئی ہر گز ہر گز شادی نہیں
کروں گا۔۔۔“ سب اس آواز پر چونک گئے، عورتوں اور بچوں کی تو جان ہی نکل
گئی۔ درباری لال واپس اپنی جگہ پر آکر ایوننگ نیوز کے ورق الٹنے لگا اور پھر ارورا

سنیما کی طرف سے گھر کو مڑتی ہوئی سڑک پہ دیکھنے لگا، جہاں اسے کاسنی رنگ کی ساڑھی کی تلاش تھی۔

اندر سب ہنس رہے تھے۔ماں بھی ان میں آکر شامل ہوگئی تھی۔ درباری گھر بھر کا بانکا تھا۔ جس طریقے سے وہ بالوں پہ ہیئر ٹانک لگاتا، محنت سے ان کو بٹھاتا۔ قینچی لے کر، آئینے کے سامنے گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے مونچھوں کی نوک میں صرف کرتا، سب بانکپن کی دلیلیں ہی تو تھیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شادی سے پہلے عمر کے اس حصّے میں لڑکے، لڑکیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور لڑکیاں لڑکوں کی سی۔ پھر شادی ہوتی ہے۔ آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جاکر اپنا اپنا کام سنبھالتے ہیں۔ درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں، یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں اور مرد کہتے تھے۔۔۔ بربادی کی!

برآمدے میں سکھ ترکھان نے جالی لگانے کا کام آج ہی شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بے شکل، بے قاعدہ اور کھردری سی لکڑی کو چھیلتا، اس پر رندہ کرتا رہا تھا اور اسی لئے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چھپٹیاں بکھری ہوئی تھیں اور

پیروں میں لگ رہی تھیں۔۔۔ جبھی سامنے ڈان باسکو اسکول میں گھنٹی بجی اور سفید سفید قمیص اور نیلی نیلی نیکریں پہنے ہوئے لڑکے، ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، ہاسٹل کے کمروں سے نکلے۔ شاید وہ شام کی دعا کے لئے گرجے کی طرف جا رہے تھے۔ اسکول کی گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے، ابھی تک فادر بچوں کو فٹ بال کھلا رہا تھا۔ اس نے بھی سیٹی بجادی، کھیل ختم کر دیا مگر سیتا نہ آئی۔۔۔

اروراسنیما کی طرف سے ادھر آنے والی سڑک پر کچھ گائیں السائی سی بیٹھی تھیں اور جگالی کر رہی تھیں۔ پھر اس جانب سے ایک کار اندر کی طرف مڑی اور دائیں طرف کی بلڈنگ کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ جبھی ایک موٹی سی عورت آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے پیچھے مدراسی ہوٹل اڈپی کا مالک راما سوامی آ رہا تھا۔ وہ بھی موٹا تھا۔ اگرچہ وہ موٹی عورت اور اڈپی کا مالک راما سوامی ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ تاہم یہاں درباری کے ہاں سے یہی معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو ٹھیلتے دھکیلتے، کوئی عجیب سا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔

سیتا کی بجائے الٹی طرف سے مصری چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی گود

میں بچہ تھا۔۔۔ ببّل! ببّل ایک تندرست بچہ تھا۔ گول مٹول، نرم نرم، جیسے اسفنج کا بنا ہوا۔ اس نے یوں تو کئی دانت نکال لئے تھے لیکن نیچے کے دو دانت نسبتاً بڑے سے تھے۔ کمینہ ہنستا تو والٹ ڈزنی کا خرگوش معلوم ہوتا۔ آج تک کوئی ایسا دکھائی نہ دیا جو ببّل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار نہ ہنس دیا ہو۔

"ببّل!" درباری نے پکارا اور ہاتھ بچے کی طرف پھیلا دیے۔ مسکراتے ہوئے ببّل نے درباری کی طرف دیکھا اور اندر کی کسی بے بس سی تحریک سے ایکا ایکی درباری کی طرف ہمکنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں مصری سے سنبھالا نہ جا رہا تھا۔

"ٹھہرو!" درباری نے کہا اور کرمرا لینے کے لئے اندر لپک گیا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔ ببّل کے چہرے پر ایک پُر خلوص مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور پل بھر میں وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ یہ ساری دنیا دھوکا ہے۔ پھر جیسے وہ مایوس ہو رہا تھا، ایسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببّل کی ماں، مصری ایک بھکارن تھی۔ احتیاج کی بنا پر اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ببّل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا تھا۔ بازار میں جاتی ہوئی وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پاس کھڑی ہو جاتی اور ببّل ایک ریہرسل کئے ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیص کو کھینچنے لگتا اور اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جو اسے مطلوب ہوتی۔ آدمی دیکھتا، نظریں بچاتا، پھر دیکھتا اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببّل کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ مصری بابو کے چلے جانے کے بعد ببّل کے ہاتھ سے وہ چیز لے لیتی اور دکاندار کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتی۔ ببّل روتا چلاتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببّل اور اس کی ماں مصری کا رشتہ ایسا نہ تھا۔ کرمرا لے کر اسے بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا؟ کرمرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دونی یا چونی مل جاتی تھی جس سے ببّل کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو اپنا کرمرا چاہئے تھا، جسے ماں نہیں چھینتی تھی اور نہ کسی دکاندار کو دیتی تھی۔ کرمرا وہ سیدھا منہ میں ڈال لیتا اور دانتوں میں پپولتے ہوئے ہمک ہمک کر اچھل اچھل کر اپنی

خوشنودی کا اظہار کرتا۔ آج جب درباری نے ببّل کو گود میں اٹھایا تو ایک ہی بار میں کرمرے سے مٹھی بھرتے ہوئے وہ ماں کی طرف لوٹنے، لپکنے لگا۔ درباری نے ببّل کو بہت روکا، پیار دلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اوں اوں کرتا ہوا وہ تو جیسے ماں کی طرف گراہی جارہا تھا۔

درباری نے کہا۔ ”کمینے۔۔۔ سالے۔۔۔“ اندر سے صالح یا سرداری کی آواز آئی، ”کیا حکم ہے حضور؟“

”آپ کو عرض نہیں کیا، فیض گنجور۔“ درباری نے اندر کی طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر ببّل کے پیارے دلارے سے گالوں پر چپت لگاتے اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولا، ”اتنا خود غرض۔۔۔؟ سلام نہ دعا، شکریہ نہ دھنیہ واد۔۔۔ کام نکل گیا تو اب تو کون اور میں کون؟“

مصری، فٹ پاتھ کی زندگی نے شرم کو جس کے لے ایک تکلف بنا دیا تھا، بے باکی سے بولی، ”یہ سب ایسے ہی ہوتے ہیں، بابو جی!“ اور پھر ببّل کو چھاتی میں چھپاتی

وہیں کھڑی وہ اپنی دونی یا چونی کا انتظار کرنے لگی۔ ببّل ہمیشہ کی طرح الف نہیں تو اب ننگا ضرور تھا کیونکہ بدن پر کمر کے نزدیک وہ ایک کالا سا تاگا پہنے ہوئے تھا جس میں ایک تعویذ لٹک رہا تھا۔ اس "لباس" میں خوش، ماں کے پاس پہنچتے ہی اس نے اپنا منہ مصری کی بڑی بڑی چھاتیوں میں چھپا دیا جہاں سے وہ ایک بہت بڑے فاتح کی طرح مڑ کر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی بہت بڑے قلعے میں پہنچ گیا ہے۔ پھر نظروں کے تیر و ترکش تانے وہ قلعے کے کنگروں پر بیٹھا، سامنے کسی جدال فوج کا جائزہ لینے لگا، یورش سے پہلے ہی جس کے چھکے چھوٹ گئے۔ پھر ایکا ایکی، کسی پروں والے، خیالی گھوڑے پر بیٹھا وہ کسی شہسوار کی طرح لپکنے لگا۔ آگے ہی آگے، اوپر ہی اوپر۔۔۔ اور منزلیں تسخیر ہو ہو کر اس کے پیروں میں پڑی ہوتی ہیں۔

مصری ایک پکے بلکہ کالے رنگ کی جوان عورت تھی اور ببّل گورا چٹا۔۔۔ یہ کیسے ہوا؟ درباری نے کبھی نہ پوچھا۔ وہ سمجھتا تھا یہ غریب عورتیں کتنی بے سہارا ہوتی ہیں۔ سڑک کے کنارے پڑی ہوئی مصری کو کوئی بابو آٹھ آنے روپے کے

عوض ببّل دے گیا ہو گا۔

"آپ کے پاس تو پھر بھی چلا آتا ہے، بابو جی۔ ورنہ یہ ہل کٹ۔۔ کسی مرد کے پاس نہیں جاتا۔"

"کیوں، کیوں؟" درباری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مالوم نہیں۔" مصری کہنے لگی اور پھر پیار سے ببّل کی طرف دیکھتی ہوئی بولی، "ہاں عورتوں کے پاس چلا جاتا ہے۔"

درباری جی کھول کے ہنسا، "بدمعاش ہے نا۔۔ ابھی سے عورتوں کی چاٹ لگی ہے۔ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟" مصری خوب شرمائی اور خوب ہی اترائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنی گود میں ان گنت گوپیوں والے کنہیا کو کھلا رہی ہے اور مصری کے تصور میں جو گوپیاں تھیں وہ خود بھی ان میں سے ایک تھی جیسے ببّل مصری کا من تھا اور مصری کی اپنی برتیاں اس کے ارد گرد ناچ رہی تھیں۔۔۔ ببّل ابھی ایک گوپی کے ساتھ تھا پھر انیک کے ساتھ! درباری نے جو مصری بائی کے ساتھ

تھوڑی سی آزادی لی تھی، اسی سے گھبرا کر پوچھ بیٹھا، ”اس کا باپ کیا کرتا ہے، مصری؟“

”اس کا باپ۔۔۔؟“ مصری کو جیسے سوچنے میں وقت لگا، ”نہیں ہے۔“

اس جواب میں بہت سی باتیں تھیں۔ یہ بھی تھی کہ وہ مر چکا ہے اور یہ بھی کہ مرنے سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ مصری کہیں دور دیکھنے لگی اور پھر درباری لال کی نگاہوں کے تاسف کو دور کرتے ہوئے بولی، ”ایک بار وہ پھر آیا تھا۔۔۔ مجھے یوں ہی لگا، جیسے۔۔۔ وہی ہے۔ لیکن۔۔۔ میں کیا کہہ سکتی تھی، بابو جی۔۔۔؟ میں نے تو اسے جی بھر کے دیکھا بھی نہ تھا۔۔۔ جب تک میں نے اس بچے کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ کبھی گوپو، کبھی ناریاں کہہ کے پکارتی تھی۔ جبھی اس نے اس کے ہاتھ پر پانچ کا ایک نوٹ رکھا اور بڑے پیار سے پکارا۔۔۔ ببّل۔۔۔! جب سے میں نے اس کا نام ببّل رکھ دیا ہے۔۔۔“

اور مصری پھر سوچنے لگی، ”اس کا باپ نہ ہوتا تو پانچ روپے دیتا؟“ درباری بھی

سوچنے لگا، ''ہو سکتا ہے وہ آدمی نہیں۔۔۔ پانچ روپے کا نوٹ ہی اس بچے کا باپ ہو۔'' درباری نے آج اٹھنی مصری کے ہاتھ پر رکھنے کی بجائے ببّل کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ببّل نے سکے کو ہاتھ میں لیا، زور زور سے بازو کو ہمکایا اور پھر اسے پھینک دیا۔ اٹھنی سڑک پر کے مین ہول میں گرنے ہی والی تھی کہ جیسے مصری کی تقدیر کو ایک خشک، بے بضاعت سے آم کے چھلکے نے اسے روک لیا۔ مصری نے جھک کر اٹھنی اٹھائی اور ببّل کو سینے سے لپٹاتے ہوئے بولی، ''لچا ہے نا۔۔۔'' اور پھر اسے چومتے ہوئے وہ درباری لال سے بولی، ''سچ پوچھو، بابو جی! تو میرا مرد یہی ہے۔''

''تیرا مرد۔۔۔؟''

''ہاں!'' مصری نے ببّل کو سنبھالا جو اپنی ماں کے سر پر سے پلو کھینچ رہا تھا اور کہنے لگی، ''یہ کماتا ہے، میں کھاتی ہوں۔''

مصری بہت باتونی تھی۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی۔ ببّل اور بھی کر مرا مانگتا لیکن

درباری کو اپنی نظروں کے افق پر کاسنی رنگ لہراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جلدی سے مصری کے آبنوسی حسن اور ببّل کی گوری چٹی معصومیت کو جھٹک دیا اور "میں چلا، صالح بھائی۔۔۔ اچھا بھائی" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ پتلون کے پائنچے میں اسے لکڑی کے چھلکے اڑتے ہوئے دکھائی دیے، جنہیں درباری نے جھک کر باہر نکالا اور سیتا کے پاس جا پہنچا۔

شیواجی پارک میں 'سمندر کے کنارے' کلب اور بھیل پوری والوں سے کچھ دور ہٹ کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ سیتا اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی تھی جس کی ماں تو تھی پر باپ مر چکا تھا۔ گھر کی حالت کچھ اتنی خراب بھی نہ تھی کیونکہ مکان اپنا تھا جس کے مکینوں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا اور کبھی نہیں۔ سیتا کی ماں کچھمن دئی یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن شادی سے زیادہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آئے جو ہر مہینے اپنے "رباب" سے کرایہ اگاہے تاکہ سیتا کے کہنے کے مطابق دروازے پر ہر مہینے جو بھیڑیا دکھائی دیتا ہے، بھاگ جائے۔۔۔ اور جینا سکھی ہو جائے۔ کچھمن دئی سے

سیتا نے درباری کی بات بھی کی۔ پہلے تو ماں شک اور وسوسے کا اظہار کرنے لگی۔ لیکن جب اسے پتہ چلا، درباری کا پورا نام درباری لال مہتا ہے تو اس نے جھٹ سے اجازت دے دی کیونکہ بمبئ میں جو لوگ مکانوں کا کرایہ اگاہتے ہیں، انہیں مہتا بولتے ہیں۔

سیتا کا قد درمیانہ تھا لیکن بدن کا تناسب ایسا جو مردوں کے دل میں جذبے بیدار کیا کرتا ہے اور کوئی بے خود سی سیٹی ان کے ہونٹوں پر چلی آتی ہے۔ چہرے کی تراش خراش اچھی تھی لیکن اِس کا پاس آنے ہی سے پتہ چلتا تھا۔ پلکیں کچھ نم سی رہتیں کیونکہ سیتا کی آنکھیں تھوڑا اندر دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے بچاؤ کے لئے پلکوں کو جھکنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ ان دھنسی ہوئی آنکھوں ہی کی وجہ سے تھا کہ سیتا مرد کے دل میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھی۔ وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے، یہ الگ بات تھی، لیکن جانتی وہ سب تھی۔ ہاں، سیتا کے بال بہت لمبے تھے جن کے کارن درباری اسے پوچھا کرتا، ”تمہارے گھر میں کوئی کسی بنگالن کو بھی بیاہ کر لایا تھا؟ اور سیتا کہتی، ”میں خود جو ہوں بنگالن۔۔۔ میرا نام سیتا موجمدار ہے۔۔۔“

درباری کہتا، ”سیتا مزے دار۔“ اور سیتا ہنسنے لگتی۔ وہ خوش تھی کہ اس کا قد صرف اتنا ہے جس سے وہ اپنے حسین، کالے، چمکیلے اور لچکیلے بالوں والے سر کو درباری کی چھاتی پر رکھ سکتی ہے اور اپنے وجود کی روح تک کو کسی کے حوالے کر کے اپنے سارے دکھ بھول سکتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے وہ پتی اور پتا کو ایک کر سکتی ہے۔

دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا سے پیار کر رہا تھا۔ سیتا نہ چاہتی تھی کہ اس کا پیار اپنی حد سے گزر جائے۔ کمر کے گرد ہاتھ پڑتے ہی سیتا چوکنی ہونے لگی۔ اس نے درباری کو باتوں میں لگانا چاہا۔ بلاؤز میں سے اس نے ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیا نکالی اور درباری کے منہ کے پاس کرتے ہوئے بولی، ”دیکھو۔۔۔ میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں؟“

”کیا لائی ہے؟“ درباری نے پوچھا اور ان جانے میں سیتا کی کمر سے ہاتھ نکال کر ڈبیا کی طرف بڑھا دیا۔ سیتا نے ڈبیا کو پرے ہٹا لیا اور بولی، ”ایسے نہیں۔۔۔ میں خود دکھاؤں گی۔“ اور پھر اسے درباری کی ناک کے پاس کرتے ہوئے بولی،

”سونگھو۔“

شامت اعمال درباری نے ڈبیا کو سونگھ لیا اور اسے چھینکیں آنے لگیں۔ محبت کا سارا کھیل رک گیا۔ درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا اور جیب سے رومال نکال کر بار بار اپنی ناک کو پونچھ رہا تھا اور سیتا پاس بیٹھی ہنستی جا رہی تھی۔

”یہ۔۔۔“ درباری نے کہا اور پھر چھینکتے ہوئے بولا، ”کیا مذاق ہے؟“سیتا کہنے لگی، ”تم اسے مذاق کہتے ہو۔۔۔؟ بیس روپے تولہ کی نسوار ہے۔“

”نسوار؟“

”ہاں!“سیتا بولی، ”تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو۔“

درباری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی، ”یاد ہے پہلی بار تم مجھے کہاں ملے تھے؟“

”یاد نہیں۔“ درباری نے سر ہلاتے ہوئے کہا، ”صرف اتنا ہی پتہ ہے، تم سے کہیں پہلی بار ملا تھا۔“

”وہاں۔۔۔“سیتا نے سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ”تم نہا رہے تھے اور چھینک رہے تھے۔ میرے ساتھ تین چار لڑکیاں اور بھی تھیں۔ اس دن دفتر میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور ہم یونہی گھومتی گھماتی ادھر جا نکلیں۔۔۔“

”ادھر کیوں؟“

”یونہی۔“سیتا نے کہا، ”چھٹی ہوتے ہی نہ جانے ہم سب لڑکیوں کو کیا ہونے لگتا ہے؟ ہم گھر بیٹھ ہی نہیں سکتیں۔ ایسے ہی باہر نکل جاتی ہیں جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ پھر ہوتا ہواتا تو کچھ نہیں، جبھی پتہ چلتا ہے۔۔۔ کوکا کولا پی رہی ہیں!“سیتا ہنسی تو ساتھ درباری بھی ہنس دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی، ”ہم سب تمہاری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھیں کیونکہ تم چھینکتے ہوئے بورڈ سے

فوّارے تک اور فوّارے سے کنارے تک آ جا رہے تھے اور ایسا کرنے میں سر سے پیر تک دہرے تہرے ہوئے جاتے تھے۔۔۔ بچے کی طرح میرا جی چاہا، بھاگ کے تمہیں پکڑ لوں اور پلو سے تمہارا منہ تمہاری ناک پونچھوں اور پیچھے ایک چپت لگا کے کہوں، ''اب جاؤ مزے اڑاؤ۔۔۔''

درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ ''دوسری لڑکیاں کون تھیں؟''

''ایک تو کمد تھی۔''سیتا بولی، ''دوسری جولی۔۔۔ وہاں، کھاڑی کے پار ماؤنٹ میری کے پاس رہتی ہے۔ تیسری۔۔۔'' اور پھر ایکا ایکی رکتے ہوئے کہنے لگی، ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ایسے ہی۔'' درباری نے جواب دیا، ''تمہاری سہیلیاں تمہاری جوتی کی بھی ریس نہیں کرتیں۔''

''تم نے دیکھی ہیں؟''

''دیکھی تو نہیں۔''

سیتا کا چہرہ جو تھوڑا کھل اٹھا تھا، ماند پڑ گیا۔ جبھی ایک چھینک نے درباری کے چہرے پہ پر تولے لیکن رک گئی۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا، ”آج دن ڈوبتا ہی نہیں۔“

سمندر میں جوار شروع ہو چکا تھا۔ لہریں کناروں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور اپنے ساتھ بھیل پوری کے بے شمار پتّل، گنڈیری اور مونگ پھلی کے چھلکے، ناریل کے خودے لا رہی تھیں۔ پھر بیچ میں کہیں کوئلے بھی دکھائی دیتے تھے جو دور اندر دخانی کشتیوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا غم ہلکا کرنے کے لئے سمندر میں پھینک دیے تھے۔ تیل کا الزام بھی خشکی پہ ٹال دیا تھا اور ان کا خالی کیا ہوا ڈیزل ریتے پر پہنچ کر اس کے ایک بڑے سے حصّے کو چکنا اور سیاہ بنا رہا تھا۔ سیتا نے مڑ کر دیکھا، درباری کچھ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہیوں کے پرے اس کے چکنے چہرے پر چھپٹ رہے تھے۔۔۔

دن ڈوب رہا تھا۔ اس نے اپنے لانبے لانبے بازو دنیا کے دونوں کناروں سے سمیٹے اور انہیں بغل میں دبا کر، ایک گہرے، کیسری رنگ کی گٹھری سی بنا، دور پچھم

کے گہرے گہرے پانیوں میں اترنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا تیج زمین کی گولائیوں میں گم ہو گیا۔ اب کنارے اور اس کے مکانوں اور مکینوں پر وہی روشنی تھی جو آسمان پر کے آوارہ بادلوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے زمین پر پڑتی ہے اور جو ہولے ہولے دھیرے دھیرے، بڑے پیار سے اندھیرے کو اپنی جگہ دیتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔ لو اب تمہارا راج ہے۔ جاؤ، موج اڑاؤ۔۔۔

وہی چھینک جس نے درباری کو سیتا سے کوسوں دور پھینک دیا تھا، ایک ہی وار میں اس کے قریب بھی لے آئی۔۔۔ سیتا کانپنے لگی، درباری ہانپنے لگا۔۔۔ اندھیرے کا تسلط ہوتے ہی پول اور کلب اور سڑک پر کے قمقمے تو ایک طرف، پھیری والوں کے جھابوں اور ٹھیلوں پر ٹمٹمانے والے دیے بھی لرزنے لگے۔ جبھی جیسے دیوار میں سے آواز آئی، "درباری! کیا کرتے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے۔۔۔" درباری نے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا، "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔"

"پیار کا مطلب۔۔۔ یہ تھوڑے ہوتا ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں۔۔۔" اور درباری اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے ٹھیک کر کے جانے لگا۔ سیتا نے اسے روکنے کی کوشش کی اور التجا آمیز لہجے میں بولی، "کیا کر رہے ہو، چاند۔۔۔؟" اور ریت پر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے لپٹ گئی جو غصے سے ہانپ رہا تھا۔ درباری نے اپنے پیر ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑا لئے اور بولا، Bitch"۔۔۔ بڑی پاکیزہ بنتی ہے، سمجھتی ہے۔۔۔۔"

"میں کچھ نہیں سمجھتی۔" سیتا نے وہیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر پھر سے درباری کو پکڑتے ہوئے کہا، "میں تمہاری ہوں، چندا۔۔۔ نس نس، پور پور تمہاری ہوں۔ پر میں، ایک بدھوا ماں کی بیٹی ہوں۔۔۔ مجھ سے شادی کر لو، پھر۔۔۔"

"کوئی شادی وادی نہیں۔۔۔" درباری بولا، "تم سے جو کہہ دیا، کیا وہ کافی نہیں؟ کیا منتر پھیرے ضروری ہیں؟ قانون کی پکڑ، اس کی اوٹ ضروری ہے؟" اور درباری لال رک گیا جیسے اب بھی اسے امید تھی۔۔۔

”ہاں ضروری ہے۔“سیتاروتے ہوئے بولی،”یہ دنیا میں نے، تم نے نہیں بنائی۔“

درباری کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ بولا،”میں اس پیار کو نہیں مانتا، جس میں بیچ کوئی بھی پردہ، کوئی بھی شرط ہو۔ روحوں کا ملنا ضروری ہے تو جسموں کا ملنا بھی۔ اس میں سویم بھگوان ہوتے ہیں۔ ایسا شاستروں میں لکھا ہے۔“

”لکھا ہوگا۔۔۔“سیتا بولی،”سب تمہاری طرح اس بات کو مانتے ہوتے۔۔۔“

”میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔“ درباری نے غصے سے پیر زمین پر مارتے ہوئے کہا، جو ریت میں دھنس گئے اور پھر وہ انہیں کھینچتے، ریت سے نکالتے ہوئے چل دیا۔ سیتا پیچھے لپکی،”سنو۔۔۔“ ابھی درباری نے دیوار کی حد نہیں پھاندی تھی۔ اب بھی وہ اس کے سہارے بیٹھ سکتے تھے اور اندھیرے کو گلے لگا سکتے تھے۔ ایک دو لڑکے فضا میں تعجب دیکھ کر رک گئے۔ پھر چنے والا آیا، جس کی پھیری میں آگ، سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہوا میں ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

اب کے سیتا نے نہ صرف درباری کے پیر پکڑے بلکہ اپنا سر اور بنگالی زلفیں ان پر

رکھ دیں اور نم آنکھیں بھی، ہونٹ بھی۔ درباری پیروں تک جل رہا تھا اور اندر کی آگ سے لرز رہا تھا۔ پیر چومتی، ان پر آنسو گراتے ہوئے سیتا نے تھوڑا اٹھ کر درباری کی طرف دیکھا اور کہنے لگی، "تم سمجھتے ہو، میں کسی برف، کسی پتھر کی بنی ہوں؟ میرا تم میں گھل مل جانے کو جی نہیں چاہتا؟ تم مجھ سے لگتے ہو تو کیا میرا انگ ٹوٹنے، دکھنے لگتا؟ پر تم کیا جانو، ایک لڑکی کے دکھ۔۔۔" اور پھر کسی ان جانے ڈر سے کانپتی ہوئی بولی، "میں نہیں کہتی یہ دکھ تم نے دیے ہیں۔ یہ بھگوان نے دیے ہیں۔ بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔۔۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" درباری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "مرد سب سہ سکتا ہے توہین نہیں سہ سکتا۔"

"کس کی توہین؟"

درباری نے جواب دینے کی بجائے سیتا کے ٹھوکر ماری اور وہ پیچھے کی طرف جا گری۔ خود وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روشنیوں کی طرف نکل گیا۔

سیتا ایک ایسے ڈر سے کانپے جا رہی تھی جو اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جس کا تجربہ اس نے اپنے پتا کی موت پر بھی نہ کیا تھا۔ ماں کی چھاتی میں منھ میں چھپا کر وہ سب بھول گئی تھی جیسے جلتے ہوئے پھوڑے کے گرد ہلکی ہلکی انگلیاں پھیرنے سے ایک طرح کا حظ، ایک قسم کا آرام آتا ہے۔ ایسے ہی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے اس کے سارے دکھ درد دور ہو گئے تھے۔۔۔ وہیں ریت پر پڑی پڑی سیتا دبی ہوئی سسکیاں لیتی رہی۔ بیچ میں کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مدد کے لئے تو نہیں آ رہا۔ جیسے مصیبت میں پڑی ہوئی عورت کے لئے کوئی نہ کوئی بانکا ضرور چلا آتا ہے۔۔۔ سامنے دیے کی لو میں کوئی چیز چمکی۔ سیتا نے اٹھائی تو وہ چاندی کی ڈبیا تھی جو نیچے جا گری تھی اور اب۔۔۔ اس میں ریت چلی آئی تھی۔۔۔

یہ حقیقت تھی کہ درباری سیتا سے پیار کرتا تھا، لیکن اتنا نہیں، جتنا سیتا کرتی تھی۔ سیتا تو جیسے اس دنیا میں اپنے نام کو بجا ثابت کرنے کے لئے آئی تھی اور اب اشوک باٹیکا میں پڑی دیکھ رہی تھی کہ کوئی اوپر سے سندیسے میں انگوٹھی

پھینکے۔۔۔ لیکن رام جی کے زمانے سے آج تک بیچ میں کیا کچھ ہو گیا تھا۔ اب تو انگریزی ''فن'' چلا آیا تھا، جس سے درباری پورا لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

گھر میں جالی لگ گئی تھی۔ تین دن خوب ہی پریشان کرنے کے بعد سکھ ترکھان چھٹی کر گیا تھا۔ صاف سُتھرے بر آمدے میں بیٹھے ہوئے درباری خالی خولی نگاہوں سے سڑک کے اس موڑ کو دیکھ رہا تھا، جہاں کبھی کاسنی اور کبھی سردئی، کبھی دھانی اور کبھی جوگیا رنگ لہرایا کرتے تھے۔ پاس درباری کا بھانجا محمود یا بنواری سرکنڈے اور ٹین سے بنے ہوئے ایک بدوضع کھلونے سے کھیل رہا تھا، جس سے اس کے ہاتھ کے کٹ جانے کا ڈر تھا۔ شاید اسی لئے اندر سے ستونتی یا کنیز بھاگی ہوئی آئی اور آتے ہی بچے سے اس کا کھلونا چھین لیا۔ بچہ رونے لگے، مچلنے لگا۔

''ہے ہے۔۔۔'' درباری نے احتجاج کیا، ''کیا کر رہی ہو آپا؟''

''تم چپ رہو جی۔۔۔'' وہ بولی، ''تم سے ہزار بار کہا ہے، مجھے آپا مت کہا کرو۔۔۔

دیدی کہتے کیا سانپ سونگھتا ہے؟"

"اچھا جی!" درباری بولا، "اور اصل بات کی بات ہی نہیں۔ دیکھو تو کیسے رو رہا ہے۔۔۔ ایسے تو لارڈ کچنر بھی پورا بیڑا ڈوب جانے پر نہیں رویا ہو گا۔۔۔ دوا سے کھلونا۔"

"کیسے دوں۔۔۔؟ کہیں آنکھ پھوڑ لے۔۔۔"

"سب بچے الٹے سیدھے کھلونوں سے کھیلتے آئے ہیں۔ کتنوں کی آنکھ پھوٹی ہے؟"

"جتنا یہ شیطان ہے، کوئی اور بھی ہے؟"

"سب ماؤں کو اپنا بچہ اتنا ہی شیطان معلوم ہوتا ہے۔"

اور محمود دیا بنواری بڑی بیزاری سے رو رہا تھا۔ گھر بھر کو اس نے سر پر اٹھا لیا تھا۔ درباری نے طاق پر سے جاپانی بلی اٹھا کر دی جو چابی دیتے ہی بھاگنا اور قلابازیاں

لگانا شروع کر دیتی تھی، جسے دیکھ دیکھ کر بچے تو کیا، بڑے بھی محظوظ ہونے لگتے تھے لیکن بچوں کو تو وہی کھلونا چاہیئے جو کسی نے چھینا ہے۔ درباری نے برے برے منہ بنائے، کیسے کیسے خو خو، خا خا کیا، منہ میں انگلی ڈال کر ہنومان بنا۔ پھر جانی واکر، آغا۔۔۔ لیکن وہ رو رہا تھا۔ اسے اپنا وہی کھلونا چاہیئے تھا۔ درباری کا جی چاہا، اسے تھپڑ مار دے۔ اگر بچے کے اور رونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ضرور مار دیتا۔ درباری نے ایکا ایکی جھلا کر کہا، ''اب بند بھی کر، سالے۔۔۔''

اندر سے آواز آئی، ''رونے دے یار۔'' بچہ رو رہا تھا۔ آخر دیدی بھاگی آئی، الٹے پیروں۔

''ہے رام۔''

''ہائے اللہ کیوں نہیں کہتیں؟''

''بھگوان کے لیے۔۔۔ تم چپ رہو۔''

''خدا کے لئے کہو تو۔۔''

پھر ستونتی یا کنیز جیسے کھلونا چھین کر لے گئی تھی، ویسے ہی لوٹا بھی گئی، ”لے میرے باپ۔“ اس نے کھلونے کو بچے کو ہاتھ میں ٹھونستے ہوئے کہا اور پھر جیسے اس کی حالت زار دیکھ بھی نہ سکتی ہو، اسے اٹھایا، چھاتی سے لگایا، ہلورے دیے۔ قمیص سے اس کا منھ پونچھا، ناک صاف کی۔ چوما، چاٹا۔۔۔ اور اس کے کہے کے مطابق ”بڑی ٹھنڈ پڑی۔۔۔“ پھر بہت گالیاں اپنے آپ کو دیں، ”ہائے مر جائے ایسی ماں۔۔۔ نہ رہے اس دنیا میں، لال کو کتنا رلایا ہے۔“ اور پھر اپنے پتی یا شوہر کی طرف دیکھتے ہی برس پڑی، ”دیکھو تو کیا مزے سے بیٹھے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ خاصے بے مزہ دکھائی دے رہے تھے!

درباری بولا، ”اب چاہے ہاتھ نہیں، گردن بھی کاٹ لے۔“

”کاٹ لے۔“ دیدی بولی، ”مروں گی میں۔۔۔ تم لوگوں کو اتنا سا بھی وہ نہ ہو گا۔“

”ہو گا یا نہیں۔۔۔“ درباری بولا، ”کہتے ہیں۔۔۔ نادان بھی وہی کرتا ہے جو دانا

کرتا ہے، لیکن ہزار جھک مارنے کے بعد۔۔۔ پہلے ہی چھیننے کی بے وقوفی نہ کی ہوتی۔"

"ہاں، میں بے وقوف ہوں۔" دیدی کہتی ہوئی بچے کو اندر لے گئی، "ماں ہونا اور عقل بھی رکھنا الگ باتیں ہیں۔"

جبھی سامنے اروراسنیما کی طرف سے آنے والے موڑ پر نارنجی سارنگ دو تین بار لہرایا۔ درباری نے جلدی سے کپڑے ٹھیک کئے، سر پر ٹوپی رکھی اور باہر نکل گیا۔ موڑ پر سیتا کھڑی تھی۔ اس نے ایک کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی اندر دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نم ہو گئی تھیں۔

"کہیے حضور۔۔۔ کیا حکم ہے؟" درباری نے پوچھا۔ سیتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ درباری کو یوں لگا جیسے سیتا کچھ کانپ سی رہی ہو۔ درباری کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور بولا، "اگر چپ ہی رہنا ہے، تو پھر۔۔۔" اور وہ لوٹنے لگا۔

”سنو!“سیتا ایکا ایکی مڑتی ہوئی بولی، ”مجھے شما کر دو۔ اس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔“ درباری نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اب تو نہیں ہو گی؟“سیتا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”جہاں کہوں گا، میرے ساتھ چلو گی؟“

سیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور منہ پرے کرتی ہوئی ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ درباری کے بدن میں خون کا دورہ جیسے ایکا ایکی تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھُردرے سے ہاتھ پھیلائے اور سیتا کا نرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا، ”تو تو ایسے ہی ڈر رہی ہے سیتے۔۔۔! تجھے دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں بڑا اینچ ہوں۔“

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی۔ بولی، ”نہیں۔۔۔ ایسا کیوں؟“

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ شیواجی پارک میں، دیوار کے نیچے۔۔۔ دن ڈوب چکا تھا۔ آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر

منعکس ہونے والی روشنی کو ادھر زمین پر پھینک دے۔ اس لئے اندھیرے نے جلدی ہی دنیا کو لپیک لیا۔ سامنے مہاتما گاندھی سوئمنگ پول کے ارد گرد بنے ہوئے جنگلے، خاکے بنے اور پھر معدوم ہو گئے۔ درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے سیتا منفعل سی بیٹھی رہی۔ درباری ایک دم جھلا اٹھا اور بولا، ”کچھ ہنسو، بولو بھی نا۔۔۔“ سیتا کو ہنسنا پڑا۔ درباری نے سیتا کی کھوکھلی ہنسی کی نقل اتاری اور سیتا سچ مچ ہی ہنس دی۔ درباری حوصلہ پا کر بولا، ”تمہیں کیا سچ مچ مجھ پر وشواس نہیں؟ “

”یہ بات نہیں۔“ سیتا بولی، ”تم مجھ سے شادی کر بھی لوگے، تو بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھوگے۔ سمجھوگے، میں ایسی ہی تھی۔۔۔“

”نہیں سیتے، میں نہیں سمجھوں گا۔۔۔ کبھی نہیں سمجھوں گا۔“

جبھی کچھ لوگ ہاتھ میں لوہے کی سلاخیں لئے چلے آئے۔ درباری چونکا۔ اس کی تسلی ہوئی جب انہوں نے سلاخیں ریتے میں مارنی شروع کر دیں۔ وہ بیوڑے کے اس دفینے کو دیکھ رہے تھے جو دو ایک دن پہلے انہوں نے ریتے میں دبایا ہو گا

اور اب سمندر میں جوار آنے سے پہلے اسے برآمد کرنا، استعمال میں لانا چاہتے تھے۔ درباری اور سیتا اٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے۔ مڑ کر دیکھا تو دیوار کے اوپر، بمبئی کے برتن مانجھنے والے راما لوگ بیٹھے تھے اور آپس میں ٹھٹھا کر رہے تھے۔ درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا رہی تھی، لجا رہی تھی، پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ وہ مکمل طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی۔ آج اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ تو کسی روٹھے کو منانا چاہتی تھی اور اس کے لئے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی۔

جبھی کچھ من چلے ”اسے مرے دل کہیں۔۔۔“ گاتے ہوئے پاس سے گزرے۔ پھر ایک پولیس مین آیا اور درباری جھلا کر اٹھ گیا۔ اس نے خونیں آنکھوں سے ارد گرد کے منظر کو دیکھا اور انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دی اور بولا، ”چلو سیتے، جو ہو چلیں گے۔“

”جو ہو۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ اٹھو، کیڈل روڈ سے ٹیکسی لیتے ہیں۔“سیتا چپ چاپ اٹھ کر درباری کے ساتھ چل دی۔

سیتا اور درباری جوہو کے بیچ پر ادھر ادھر پھر نہ سکتے تھے، کیونکہ اس میں خطرہ تھا۔ روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی۔ ابھی چند ہی دن ہوئے ایک قتل ہوا تھا۔ چند غنڈوں نے ایک میاں بیوی کو بحر زندگی کے دو کناروں پر جا کھڑا کیا تھا۔ لیکن اس دن جوہو کے سب ہوٹل، سب کاٹیج گاہکوں سے بھرے پڑے تھے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد درباری اور سیتا فورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیتا بھی تھا تو اکھڑا اکھڑا، بے تعلق۔ زبان میں ایک عجیب طرح کی لکنت تھی جیسے کوئی نشے والی چیز منھ میں رکھ لی ہو، جس سے زبان پھول گئی ہو۔

ٹیکسی حاجی علی سے ہوتے ہوئے تاردیو میں داخل ہوئی، وہاں سے اوپرا ہاؤس ہوتے ہوئے ہارن بائی روڈ پر جا پہنچی، جس کا نام اب مہاتما گاندھی روڈ ہو گیا ہے۔ ایک ہوٹل پر پہنچتے ہوئے درباری نے منیجر سے پوچھا، ”کوئی کمرہ ہے؟“ منیجر نے

غور سے درباری کی طرف دیکھا، جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی واردات کر کے آیا ہے، یا کرنے جا رہا ہے۔ پیچھے سیتا کھڑی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دونوں گناہ کے عادی نہ تھے۔ خام، بے رحم فطرت کے ہاتھوں گرفتار وہ دیوانے سے ہو رہے تھے۔ جبھی منیجر نے پوچھا، ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

”جی؟“ درباری نے ایکا ایکی سوچتے ہوئے کہا، ”اورنگ آباد سے۔“

”خوب!“ منیجر نے پیچھے سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”آپ کا سامان کہاں ہے؟“

”جی سامان تو نہیں ہے۔“

”معاف کیجئے۔“ منیجر نے درباری کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نجس اور لجلجی شے ہو اور بولا، ”اپنے پاس کوئی روم نہیں۔“

”کیا مطلب؟ ابھی تو ٹیلی فون پر۔۔۔؟“

بیرا نمبر ۲۷ جو ایک ٹرے پر ویفر، مونگ کی دال، سوڈے کی بوتلیں اور چابی لے کر جارہا تھا، بول پڑا، ”یہ ہوٹل عزت والے لوگوں کے لئے ہے صاحب“!

درباری کچھ نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، وثوق سے جانتا تھا، اس بیرے کا ٹپ ایک روپے سے زیادہ نہ تھا اور قبلہ منیجر صاحب کی عزت پانچ روپے سے۔۔۔ اور آج یہ سب کے سب ایک دم نیکی اور عزت اور شرافت کے پتلے بن بیٹھے تھے۔ وہ عزت اور شرافت کے پتلے تھے یا نہیں۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ زندگی میں کچھ بھی کر گزرنے کے لئے مشاق ہونے کی ضرورت ہے۔ نگاہوں میں ایک پیشہ ورانہ جرأت اور بے باکی اور بے حیائی لانی پڑتی ہے جس کے سامنے مدمقابل کا اخلاق، اس کی شرافت اور پارسائی جھوٹی پڑ جاتی ہے۔ درباری اپنے اندر کہیں کمزور، کہیں بزدل تھا۔۔۔ وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا۔ لوٹتے ہوئے وہ گالیاں بک رہا تھا، انگریزی میں۔ جنہیں وہ ہوٹل کے منتظمین کو سنانا بھی چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی۔

”چلو سیتا۔“ درباری نے کہا، ”پھر کبھی سہی۔“ اور دونوں ٹیکسی پر بیٹھ کر گھر کی

طرف چل دیے۔ زندگی بے کیف ہو گئی تھی۔ اتنی ہزیمت کا احساس درباری کو کبھی نہ ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کئی لوگ ہیرو ہو گئے اور بہت سے ہیرو پیروں میں آگرے۔

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہیں تھا، کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حالانکہ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ وہ دفتر سے جلدی چلا آیا تھا۔ تھکا تھکا، ٹوٹا ٹوٹا، مضمحل سا۔ اس شام کی شکست اور بے حرمتی کے بعد ایک تسکین کا سا احساس تھا جو تسکین بھی نہیں تھی۔ یہ آگ۔۔۔ یا تو پیدا ہی نہ ہوتی۔ اسی لئے بڑے، خیال کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یا تو یہ حضرت پیدا ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو آپ انسان کی اولاد کی طرح انہیں جھٹک نہیں سکتے، ان کا گلا نہیں گھونٹ سکتے کیونکہ ہر دو صورتوں میں سزا موت ہے۔ یہ دماغ کے کسی کونے میں چپکے دبکے پڑے رہیں گے، اور اس وقت آلیں گے، جب آپ مکمل طور پر نہتے ہوں گے، بالکل بے دست و پا۔۔۔ غسل دی جانے والی میت کی طرح۔

درباری اس وقت برآمدے میں بیٹھا ڈان باسکو دیوار کے ساتھ اگے ہوئے

پیڑوں کو دیکھ رہا تھا جن کی چھاؤں میں محلے کے امراء کی موٹریں سستا رہی تھیں۔ کچھ تو یہ ان امیر مزدوروں کی تھیں جو گھر سے دفتر اور دفتر سے سیدھے گھر چلے آتے تھے اور بیوی کے ساتھ جھگڑے ہی سے ان کی پوری تسلی ہو جاتی تھی اور کچھ ایسے لوگوں کی جنھوں نے انہیں چلتے پھرتے قحبہ خانے بنا رکھا تھا۔ ان کے ڈرائیوروں کو سر شام گاڑی چمکانے اور منہ سی رکھنے کی تنخواہ چپکے سے دے دی جاتی تھی۔ یہ بیرا نمبر ۲۸ تھے۔

درباری نے کھینچ کھانچ کر اس دن ہوٹل میں پیدا ہونے والی مایوسی کا، کار میں افزائش پانے والی امید سے تعلق پیدا کر لیا۔ لیکن کیا فائدہ؟ امید کو چمکانے دمکانے سے کار تھوڑے ملا کرتی ہے؟ باپ گردھاری لال مہتا تو پیسے کو ہوا بھی نہیں لگواتے تھے۔ اگلے جنم میں بھی سانپ بن کر دفینے پر بیٹھ جانے کا ارادہ تھا۔

صالح بھائی یا سرداری لال مع اپنے بیوی بچوں کے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پیچھے ٹھنٹ سے بازوؤں والی بے بچہ بھابی رہ گئی تھی، جس کی بھیا سے بچہ نہ ہو سکنے پر تکرار ہی رہتی تھی۔ وہ کہتی تھی تم میں نقص ہے اور وہ کہتے تم میں۔ وہ کہتی تم

ڈاکٹر کو دکھاؤ، وہ کہتے تم اپنا معائنہ کراؤ اور ناپید بچے مایوسی سے انہیں دیکھتے رہتے اور اپنا سر پیٹ لیتے۔

درباری مکمل طور پر بور ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اور تھوڑی دیر گھر میں رہے گا تو ماں شادی کی باتیں کرنے چلی آئے گی اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں کچھ دن تو زندگی دیکھ لے۔ آخر تو ایک نہ ایک دن ہر کسی کی شادی ہوتی ہی ہے۔۔۔ کس کے ساتھ شادی؟ سیتا لپک کر اس کے دماغ میں آتی تھی۔ سیتا ویسے ٹھیک تھی، لیکن شادی کے سلسلے میں نہیں۔ وہ بہت ایثار والی لڑکی تھی، شکل صورت سے بھی بری نہ تھی لیکن بیوی۔۔۔ بیوی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔ اسے کچھ تو چلبلا ہونا چاہئے۔ ادھر ادھر جھانکنا چاہئے تاکہ مرد کان سے پکڑ کر کہے، ''ادھر۔'' اور پھر بدھوا کی بیٹی؟ مرد سے یوں چمٹتی ہے جیسے وہ اس کا شوہر نہیں، باپ ہے۔۔۔ میں کہاں کرایے اگاہتا پھروں گا؟ ہاں تھوڑی دیر کے پیار کے لئے سیتا سے اچھی کوئی نہیں۔ کیا جسم پایا ہے!

جبھی مصری دکھائی دی اور ببّل دکھائی دیا۔۔۔ مصری دور ہی سے ''بابو جی'' کی

طرف انگلی کرتی ہوئی آرہی تھی اور ببّل وہیں سے غوں غوں غاں غاں کرتا ہوا ہمک رہا تھا۔ پھر یکا یک ببّل میں زندگی اچھلی، جیسے گیند زمین پر سے اچھلتا ہے اور مصری کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ آج ببّل خدا کے نہیں، انسان کے لباس میں تھا۔ ایک میلی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ ہاں، نیچے اللہ ہی اللہ تھا۔ پاس آتے ہی ببّل نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

"کمینہ! جیسے میں اس کے لئے کرما لیے ہی تو کھڑا ہوں۔۔۔" جیسے اندر جانا اور باہر آکر اس کے حضور باج گذاری اس کے صبر کی آخری حد ہے۔ درباری کرما لے کر باہر آیا تو آج پہلی بار اسے خیال آیا۔۔۔ مصری ایک عورت ہے، اور ببّل اس کا بچہ۔ اور یہ سب کتنا مقدس ہے۔ غریب لوگوں میں باپ ہوتا تو ہے، مگر 'محض تکلف کی چیز۔' جبھی درباری کا دماغ تیزی سے چلنے لگا۔ وہ ایک دائرے میں گھومتا تھا اور گھوم پھر کر وہیں آجاتا تھا۔ پھر کوئی کشف کی سی کیفیت ہونے لگی۔ آنکھیں پھیلنے اور سمٹنے لگیں۔ درباری لال نے آج وہیں سے کرما ببّل کو دے دیا تھا۔ جانے کیا بات تھی جو آج درباری ببّل کو گود میں نہیں لے رہا تھا۔

جیسے وہ شر مار ہا تھا۔ لیکن وہ ربڑ کی گیند۔۔۔ ببّل۔۔۔ جیسے دیوار کے ساتھ لگ کر پھر لوٹ آتا۔ یہ نہیں کہ آج اسے کر مرا نہیں چاہئے تھا۔ اسے کر مرا بھی چاہئے تھا اور آسمان کی بادشاہت بھی۔ ببّل حیران ہو رہا تھا۔۔۔ آج یہ بابو مجھے لیتا کیوں نہیں؟

"آج تم نے کتنے پیسے بنائے ہیں، مصری؟" درباری نے کچھ جھینپتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کوئی چودہ آنے۔"

"کیوں، صرف چودہ آنے کیوں؟"

"آج میرا مرد ناگ پاڑے چلا گیا تھا۔" مصری نے بے باکی سے کہا۔

"تیرا مرد؟" درباری نے حیران ہوتے ہوئے کہا، "تم نے کوئی مرد کر لیا ہے؟"

مصری ہنسی اور ببّل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر اونچا، درباری لال کے برابر کرتے ہوئے بولی، "یہ ہے میرا مرد، میرا کماؤ مرد۔۔۔ اسے آج اس کی موسی

پارلے کی چونا بھٹی لے گئی تھی۔ یہ بنیان دی، جو یہ ہل کٹ پہنتا ہی نہیں۔ یوں کندھے جھٹکتا ہے، جیسے پوری دھرتی کا بوجھ لاد دیا۔" درباری سمجھا اور ہنسنے لگا۔ ابھی تک وہ ببّل کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے رہا تھا اور ببّل کرمرا وغیرہ سب بھول کر شور مچا رہا تھا۔ مصری بولی، "ننگا رہنے والی عادت پڑ گئی تو بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

"یہ ایسے ہی اچھا لگتا ہے، مصری۔"

ببّل جیسے ہمک ہمک کر کہہ رہا تھا، "جھوٹ۔۔۔! اچھا لگتا ہوں تو پھر مجھے لیتے کیوں نہیں؟" اور اب تو وہ بہت ہی شور مچانے لگا تھا، "ہو، ہو، ہو۔۔۔"

"ببّل ہوتا ہے تو تم کتنا کما لیتی ہو؟" درباری نے پوچھا۔

"یہ؟" مصری ببّل کو نیچے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے بازو تھک گئے تھے، "یہ ہوتا ہے تو مجھے تین بھی مل جاتے ہیں، چار بھی۔۔۔" درباری نے اپنی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور مصری کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا بابو جی؟" وہ بولی اور اس کا چہرہ لال ہونے لگا۔

"تم لو نا۔" درباری بولا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا، "جلدی سے لے لو، نہیں کوئی دیکھ لے گا۔" مصری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب تک اس کا چہرہ قرمزی ہو چکا تھا۔ اس نے جلدی سے دس کا نوٹ لیا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنے نیفے میں اڑس لیا اور اس فقرے کا انتظار کرنے لگی جو اب وہ سال میں مشکل سے تین چار بار سنتی تھی۔ لیکن مصری کا رنگ سیاہ ہو گیا جب اس نے درباری کی بات سنی، "تم تو جانتی ہو، مصری!" درباری بولا، "میں اس سے کتنا پیار کرتا ہوں۔۔۔ ببّل سے۔۔۔ اگر تم اسے ایک دن کے لئے مجھے دے دو۔۔۔" مصری کچھ نہ سمجھی۔ درباری نے کہا، "میں اسے کلیجے سے لگا کے رکھوں گا، مصری۔۔۔ ایک ماں کی طرح، تمہاری طرح یہ مجھے اتنا اچھا لگتا ہے، اتنا اچھا لگتا ہے کہ۔۔۔ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔" اور درباری نے ہاتھ بڑھا کر ببّل کو لے لیا۔

ببّل ایک دم خوشی سے اچھل گیا۔ درباری کی گود میں آتے ہی اب وہ کرمروں کے لئے گردن کو یوں ادھر ادھر گھمانے لگا جیسے مور چلتے وقت اپنی گردن کو

ہلاتا گھماتا ہے۔۔۔ پھر اس کے گول گول، گدرائے ہوئے بازو کسی سائیکل کی طرح سے چلنے لگے۔ درباری نے کرمرے کے کچھ دانے ببّل کے منہ میں ڈالے۔ جنہیں لیتے ہی وہ عام طور پر ماں کی طرف لپکا کرتا تھا لیکن آج وہ درباری ہی کے بازوؤں میں شیطانی حرکتیں کرتا رہا۔ کبھی کہتا چھوڑ دو، نیچے اتار دو۔ کبھی پکڑ لو، چھاتی سے لگا لو۔ بیچ میں اس نے ماں کی طرف دیکھا، ہنسا بھی لیکن منھ درباری کی طرف کر لیا۔ ماں کو چڑانے لگا، جیسے درباری کو چڑایا کرتا تھا۔ مصری ابھی تک بھونچکی کھڑی تھی اور غیر یقینی انداز سے باپ بیٹے کی سی دونوں ہستیوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کہیں آپ کے کپڑے خراب کر دیے تو؟"

"تو کیا ہوا؟" درباری نے کہا، "بچوں کی ہر چیز امرت ہوتی ہے۔" مصری کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پہلے اس نے سوچا تھا، زندگی میں بہت ہی نایاب چیز تھوڑی دیر کے لئے اسے مرد مل گیا۔ اب اس نے سوچا میرے بچے کا باپ مل گیا اور پہلی چیز سے دوسری بہت بڑی تھی۔

"میں اسے کھلاؤں گا، پلاؤں گا، مصری۔" درباری نے وعدہ کیا، "تم رات دس بجے کے قریب اسے لے جانا۔"

"اچھا۔۔۔" مصری نے سر ہلا دیا۔

مصری چلی۔ پھر رک گئی۔ مُڑ کر بچے کی طرف دیکھا جو درباری کے بازوؤں میں کھیل رہا تھا اور اپنے ارد گرد درباری کی بند مٹھی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے نہ کھلنے پر جھلا رہا تھا۔ مصری نے آواز بھی دی، ببّل نے دیکھا بھی، مگر اسے آج کسی بات کی پروانہ تھی۔ باپ کی پروانہ تھی تو ماں کی بھی نہیں۔ مصری پھر چلی لیکن جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا۔ رک کر پھر دیکھنے لگی اور جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ ببّل رہ لے گا تو وہ جلدی جلدی چلی گئی۔ کچھ دور جا کر اس نے نیفے میں سے دس کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔

درباری ببّل کو لئے اندر آیا۔ ببّل کو کمرے کی بہت سی چیزوں میں دلچسپی پیدا ہو

گئی۔ ہر چیز اس کے لئے نئی تھی۔ ہر شئے کو وہ منھ میں ڈال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی حد نہیں۔ ایسا سواد جس کی کوئی سیما نہیں۔ جبھی ماں اندر چلی آئی اور درباری کے ہاتھ میں بچے کو دیکھ کر حیران ہو اٹھی۔ ناک پر انگلی رکھتی ہوئی بولی، "ہائے رام، یہ کیا؟"

"ببّل، ماں! مصری کا بیٹا۔" درباری بولا، "مجھے بڑا پیارا لگتا ہے۔"

"اس کی ماں کہاں ہے؟"

"گئی۔۔۔ میں نے تھوڑی دیر کھیلنے کو لے لیا ہے، ادھار۔۔۔ ایک بار پیدا کر دیا، پھر ماں کا کیا کام؟" درباری نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جارے جا۔" ماں بولی، "چھ آٹھ مہینے تک ہی ماں کی جرورت ہوتی ہے۔ پھر جیسے اپنے آپ تیرے ایسے لوٹھے بن جاتے ہیں۔"

"اچھا ماں۔" درباری نے کہا، "میں اسے پووار کالج کے سامنے والے میدان میں لے جاؤں گا، جہاں پاس ہی مجھے جگ موہن کی کتابیں بھی لوٹانی ہیں۔ تو ذرا اسے

پکڑ۔" ماں نے جھر جھری لی، "ہا۔۔۔ گندا۔" اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی، "میں تو اسے ہاتھ نہیں لگاتی۔" بھابی جو کچھ دیر پہلے آ کھڑی ہوئی تھی، بولی، "اتنا ہی شوق ہے تو اپنا ہی کیوں نہیں لے آتے؟ شادی کر لیتے؟"

"نہیں۔" درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا، "مجھے دوسروں ہی کے اچھے لگتے ہیں۔"

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی، "اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے؟"

درباری نے ببّل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا، جہاں اس کی توجہ جرمن سلور کے ایک چمچے نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ درباری خود اندر چلا گیا اور ببّل چمچے کو منہ میں ڈالتا، چُوستا رہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت نکال رہا تھا۔ ایکا ایکی ببّل کو اپنا آپ اکیلا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں، پھر بھابی کی طرف پھیلا دیے۔ ماں تو چھی چھی کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بھابی ایک لمحے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر جیسے اندر کے کسی ابال نے اسے مجبور کر دیا اور لپک کر اس نے ببّل کو اٹھا لیا۔ اور اسے سینے

سے لگا کر ملنے لگی، جیسے کسی اپار سکھ اور شانتی کے جھولے میں پڑی ہے۔ ببّل اسے گندہ نہیں لگ رہا تھا۔ من ہی من میں اس نے ببّل کو نہلا دھلا کر ایک بھکارن کے بیٹے سے کسی رانی کا بیٹا بنالیا تھا اور اندر ہی اندر اس نے سیکڑوں ریشمی اور سوتی فراک بناڈالے تھے اور سوچ رہی تھی اتنا خوبصورت ہے، میں اس کے لئے لڑکیوں والے کپڑے بنواؤں گی۔

اندر پہنچ کر درباری نے سوٹ کیس نکالا۔ اس میں کچھ کپڑے رکھے اور پھر اس کے اوپر کچھ کتابیں۔ پھر دھپ سے سوٹ کیس بند کیا اور بیٹھک کی کی طرف اڈا۔ بیٹھک میں پہنچا تو ببّل ہمیشہ کی طرح چھاتیوں میں سر دیے ہوئے تھا۔ درباری کے پہنچتے ہی اس نے منہ نکالا اور ایک فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اگلے ہی پل جانے کس جذبے، کس گنتی سے اس نے اپنے پورے پر درباری کی طرف پھیلا دیے۔ درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں ببّل کو اٹھایا، دوسرے میں سوٹ کیس تھاما اور ”اچھا بھابی۔۔۔“ کہہ کر باہر نکل گیا۔

دادر پہنچ کر، ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے درباری نے ببّل کے لئے ایک قمیص

خریدی اور ساتھ ایک نکّر بھی۔ قمیص تو جیسے تیسے ببّل نے پہن لی لیکن نکّر پہنتے وقت اس نے باقاعدہ شور مچانا، چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ جتنی دیر بھی وہ کھڑا رہا، برابر اپنی ٹانگوں سے سائیکل چلاتا رہا۔ ابھی ہمکا، پھر گرا۔ درباری ایک ہاتھ سے پکڑتا تو وہ دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا اور پھر منہ اٹھا کر درباری کی طرف حیرانی سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ عجیب آدمی ہو، ایک بچہ بھی پکڑنا نہیں آتا۔

پھر ایکا ایکی بجلی کے ایک قمقمے نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ اوپر کی طرف ہمکا۔ بجلی کے ڈر سے درباری نے ہاتھ اوپر کیا ہی تھا کہ ببّل نے پاس چلتے ہوئے ٹیبل فین کی جالی میں اپنی انگلی جاڈالی، دکاندار نے لپک کر ہاتھ ہٹالیا، نہیں تو جناب کی انگلی اڑ گئی تھی۔ جھٹکے سے ہاتھ پرے کرنے پر اس نے رونا شروع کر دیا اور جب درباری نے اسے گود میں اٹھایا تو وہ شکایت کے لہجے میں پہلے درباری اور پھر دکاندار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ اس نے مجھے مارا۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ببّل کچھ جھلا سا گیا۔ دراصل اسے نکّر کی وجہ سے تکلف ہو رہی

تھی۔ وہ ''زندگی بھر'' یوں کسا نہ گیا تھا۔ درباری نے اسے سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلے کی طرح اکڑ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ تم گاڑی پر بیٹھو، میں تم پر بیٹھوں گا۔ نہیں مجھے لے کر چلو۔۔۔ بازار میں، جہاں لوگ آ جا رہے تھے۔ پھر اس نے زور سے اوپر نیچے ہو کر آخر نکّر نکال ہی دی اور اس پر کودتے ہوئے اسے یوں چرمرر کر دیا کہ کوئی استری اس کے بل نہ سیدھے کر سکتی تھی۔ اور اب۔۔۔ نِکّر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا۔ ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا اسے، جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دنیا کو دیکھ اور دکھا رہا تھا!

درباری جب سیتا کے ہاں پہنچا تو وہ گھر پر نہ تھی۔ درباری نے سر پیٹ لیا۔ ماں نے بتایا وہ پربھا دیوی میں کمد سے ملنے گئی ہے۔ پربھا دیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا لیکن کمد کے گھر کا کیسے پتہ چلے؟ پوچھتا تو ماں کہتی۔۔۔ کیوں کام کیا ہے؟ اس لئے خاموش ہی رہنا اچھا تھا۔ اس پر ایک اور مصیبت۔۔۔ ماں بتانے لگی، پہلے مالے پہ رہنے والے سندھی نے ''نوسٹ'' دے دیا ہے۔ نوٹس دے دیا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس وقت تو حالات نے اسے نوٹس دے دیا ہے۔ کچھ دیر بیٹھا وہ ماں کی

بوڑھی باتیں سنتا رہا اور بتاتا رہا یہ ببّل اس کا بھانجا ہے۔ بڑا پیارا دلارا بچہ ہے لیکن ماں کو جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے صرف ایک بار کہا۔ کیوں رے؟ ببّل نے جواب بھی دیا، لیکن ماں نے آگے بات نہ چلائی۔

ببّل کو ماں کی بولی معلوم تھی۔ لیکن ماں ببّل کی بولی بھول چکی تھی۔ وہ پھر اپنے رونے لے بیٹھی، ''کمیٹی کہتی ہے، ہر سال اتنے پیسے مرمت پر لگایا کرو۔ اب بھلا کوئی روٹی کھائے کہ مرمت کروائے۔ کیا کیا کانون پاس ہو گئے ہیں۔ کانگریس سرکار توڈوبنے کو آئی ہے۔ اشٹ گرہی میں کیا ہو گا؟ میں تو جگادہری مائیکے لوٹ جاتی ہوں۔۔۔ تم شادی کب کروگے؟'' کوئی ہی دیر میں ماں بور ہو گئی۔ ہاں، ماں بور ہو گئی۔ بولی، ''سیتا پتہ نہیں آتی ہے کہ نہیں آتی۔ تم ٹیکسی پر تو آئے ہو۔ مجھے ذرا ماہم تک چھوڑ دو۔''

''میں ماہم کی طرف نہیں جا رہا، ماں جی۔۔۔''

''کدھر جا رہے ہو؟''

"شہر کی طرف۔"

"ٹھیک ہے۔" ماں بولی، "وہاں بھی پریل کے پاس مجھے کام ہے۔۔۔ ہنڈولے آ رہے ہیں نا، مجھے مولی خریدنی ہے۔ مولی جانتے ہو کیا ہوتی ہے؟" درباری سٹپٹا کر رہ گیا۔ ببّل تنگ کرنے لگا تھا۔ اس پر باہر ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو دل ہی دل میں ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا، "چلو ماں جی، میں آپ کو پریل چھوڑ دوں۔ راستے میں کمد کا گھر ہے نا؟"

"ہے تو۔" ماں اٹھتے ہوئے بولی، "پر آگ لگے۔۔۔ یہ بازار بمبئی کے۔۔۔ بیس بار گئی ہوں تو بیس بار ہی گھر بھول گئی۔۔۔"

"چلو، اکیسویں بار بھی بھول جانا۔"

"پر تم۔۔۔ سیتا کو لے کر کہاں جا رہے ہو؟"

"دیدی کے پاس۔۔۔ کہانا۔"

”سنا ہے وہ مسلمان ہے؟“

”کیا بات کرتی ہیں، ماں جی؟“ درباری نے جیسے کسی گرتے ہوئے پہاڑ کو تھام لیا۔ ستونتی نار کسی مسلمان عورت کا نام ہو سکتا ہے؟“

اس سے پہلے کہ ماں پورے طور پر درباری پر مسلط ہو جائے، سیتا چلی آئی۔ بہار کے ایک جھونکے کی طرح، دامن میں پتے ہی پتے، پھول ہی پھول لیے۔ اس نے آئرن گرے رنگ کی ایک چولی چست کی ہوئی تھی اور بیگمی چاولوں کے کلر کی سی ہینڈلوم ساری لپیٹ رکھی تھی، جو جسم کے سارے خطوں کو ایک آزاد، ایک طوفانی سے بہاؤ میں لے آئی تھی۔ خود وہ بہار کا جھونکا تھی، لیکن درباری کے لئے پت جھڑ کا پیغام۔ اس کے اندر کے پھول پتے ایک ایک کر کے خشک ہونے، گرنے اور کچھ آندھیوں کے ساتھ اڑنے لگے۔۔۔ اور جو ڈال پہ رہ گئے تھے، سوکھ کر، آپس میں ٹکرانے، دل کو دھڑکانے لگے۔ سیتا نے آتے ہی پہلے ببّل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں، ”کس کا بچہ ہے؟“ اور پھر لپک کر بچے کے پاس جا پہنچی، ”ہے، کتنا پیارا ہے، ببلو سا۔“

”ہاں!“ درباری نے کہا، ”ببّل ہی اس کا نام ہے، تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”مجھے کیا معلوم؟“سیتا نے تالی بجاتے ببّل کو اپنی آغوش میں بلاتے ہوئے کہا، ”ہر بچے کی شکل سے اس کے نام کا پتہ چل جاتا ہے۔۔۔ تمہیں نہیں چلتا؟“

ببّل نے پہلے شک و شبہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ جیسے برسوں سے جانتا ہو اور پھر ترازو کے انداز میں بازو اٹھا دیے۔سیتا نے اسے اٹھا لیا، چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا جھول گئی۔ بس رشتہ قائم ہوتے ہی ببّل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کسی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا اور ”او۔۔۔ او۔۔۔“ کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو، اس میں کچھ ہے، میرے لئے؟ درباری کی نگاہوں میں خواب تھے اور جب سیتا نے دیکھا تو اس کی نظروں میں سیجیں تھیں اور بچے۔ شاید ببّل سیتا کی آنکھوں میں سے منعکس ہو رہا تھا۔ درباری نے کچھ اتاولے ہو کر کہا۔ ”گھنٹہ بھر سے میں تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں، دیدی نے بُلوایا ہے۔“

سیتا نے ماں کی طرف دیکھا، "ماں۔۔۔؟"

"ہاں بیٹا۔" ماں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو۔۔۔ میں اس کے لئے کچھ بسکٹ۔۔۔"

درباری نے اور بے صبری سے کہا، "ہوتے رہیں گے، تم چلو۔۔۔ میرے پاس اتنا سا بھی وقت نہیں ہے۔۔۔" اور سیتا ببّل کے گال رگڑتی ہوئی چل دی، کہتی ہوئے، "اے تو تو تھوتا سا، موتا سا، گوتا سا ببلو ہے۔۔۔" اور سیتا دل میں اتنا سا بھی وسوسہ لیے بغیر چل دی۔ باہر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے بولی، "اس میں چلیں گے؟" درباری نے سر ہلا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو بے کیف ہو رہا تھا، خوش ہو گیا۔ پیچھے کی طرف لپک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ببّل اور سیتا اور آخر درباری بیٹھ گئے۔ جبھی سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پر پڑی۔۔۔ ایک شک کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گذری، "یہ سوٹ کیس۔۔۔؟"

"ہاں!" درباری نے کہا۔

”دیدی کے ہاں جا رہے ہو؟“

”کہیں بھی جا رہا ہوں، تمہیں اس سے کیا؟“ اور پھر ایک خشمناک نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے بولا، ”تم نے کہا نہیں تھا، جہاں بھی لے جاؤ گے جاؤں گی۔“سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ درباری کے چہرے کی رنگت، سوٹ کیس۔۔۔ بچہ۔۔۔ اس نے ڈر کے عالم میں ببّل کو سیٹ پر بٹھا دیا اور نتھنے پھلاتی ہوئی بولی، ”ہاں، کہا تھا۔“سیتا نے پھر ایک تیز سی نظر درباری پر پھینکی اور پھر اپنی نگاہیں چرا لیں۔ اسے اپنا آپ جیسے کچھ گندا لگا۔ ساری کے پلو سے اس نے اپنا لال ہوتا ہوا چہرہ پونچھا۔ درباری نے خمار آلود نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے کہا، ”سیتا! تم پھر لگی ہو، اس دن کی طرح کرنے۔“سیتا ڈر گئی، ”نہیں تو۔“ وہ بولی۔

ٹیکسی حاجی علی کے پاس سے جا رہی تھی۔ آج سمندر کا وہی رنگ تھا جو مون سون سے پہلے ہوتا ہے۔ میلا کچیلا، گندہ اور گیلا۔۔۔ شاید دور کہیں برسات شروع ہو چکی تھی اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں پڑ رہی تھیں۔۔۔ پھر وہی سفر۔۔۔ تار دیو، اوپرا ہاؤس، مہاتما گاندھی روڈ، فلورا فاؤنٹین۔۔۔ اور ایک

ہوٹل۔ آج وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں وہ اس دن گئے تھے۔ سامنے ایک بیرا کھڑا تھا۔ درباری، سیتا اور ببّل کو دیکھ کر لپکا۔ بڑی عزت، بڑے ہی احترام کے ساتھ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ درباری اترا۔ ٹیکسی والے کو پیسے دیے اور پھر بیرے کو سوٹ کیس اتارنے کا اشارہ کیا۔۔۔سیتا اتری۔ اس کی آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں اور ببّل کو اپنے بازوؤں میں لینے سے جیسے اسے کچھ تامل ہو رہا تھا۔

''اٹھاؤ نا۔۔'' درباری نے ببّل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''بچہ ہمیشہ عورت اٹھاتی ہے۔''سیتا نے کچھ بے بسی کے عالم میں ببّل کی طرف دیکھا جیسے وہ ابھی اسے اٹھانا نہ چاہتی تھی۔ لیکن درباری اور اس کے غصے سے ڈرتی تھی۔ مرد اور اس کی وحشت سے خائف تھی۔ اس نے ببّل کو اٹھا تو لیا لیکن اس سے پیار نہ کر سکتی تھی۔۔۔ اسے کچی کچی، کھٹی کھٹی، گندی گندی ڈکار سی آنے لگی تھیں۔ ہوٹل اوپر تھا۔ درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا۔۔۔ کمرہ ہے۔۔۔؟ اب کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی نگاہوں میں وہی پیشہ ورانہ بے باکی پیدا کر چکا تھا، جس کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔سیتا نے دیکھا۔۔۔ سیڑھیوں پر جیسے کسی نے تیل اور

گھی کے ڈرم کے ڈرم لڑھکا دیے ہیں۔ رسہ جس کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگ اوپر گئے تھے ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور گندہ ہو رہا تھا۔ پوری فضا سے کسی باسی دینی کی بو آ رہی تھی۔ رسے کو ہاتھ لگائے بغیر ہی سیتا درباری کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچ گئی۔

منیجر صاحب نے تینوں کو آتے دیکھا تو ان کے چہرے پر ایک عجیب مقدس سی چمک چلی آئی۔ وہ عجلت سے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا اور دونوں ہاتھ کمرے کی طرف سویپ کرتے ہوئے بولا، "ویلکم سر۔۔۔" آج سب کمروں کے دروازے سیتا اور درباری پر کھلے تھے۔ درباری نے منیجر سے کہا، ہم بلی مور سے آئے ہیں اور اس وقت ٹرانزٹ میں ہیں۔ رات گیارہ بجے والی پنجاب میل سے آگرے جائیں گے۔ جہاں تاج محل دیکھیں گے جو شاہ جہاں نے اپنی چہیتی ممتاز کے لئے بنوایا تھا۔ دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت نہ تھی، جتنا جرم کا احساس تھا۔ کیونکہ اس سے اس نے سولہ اٹھارہ بچے پیدا کئے تھے۔ اور اپنی اس زیادتی کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا۔۔۔ پر ان باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ منیجر "سر، سر" کرتا رہا۔

ضرورت پڑنے پر ہنستا بھی، ضرورت سے زیادہ بھی ہنستا۔۔۔ سر بھی ہلاتا، جھک جھک کر آداب بھی بجالاتا۔ رجسٹر پر دستخط کرنے کے بعد درباری کمرے میں پہنچا تو ببّل کے ہاتھ میں بسکٹ تھے۔

"یہ کس نے دیے؟"

"بیرے نے۔" سیتا بولی۔

"اور یہ۔۔۔ آئس کریم کی کون؟"

"پڑوس کا ایک مہمان دے گیا ہے۔"

اور بیرا بچے کے لئے کٹوری میں دودھ لا رہا تھا۔۔۔ جیسے وہ صدیوں سے بیکار تھا اور آج ایکا ایکی اسے کوئی کام، ایسا روزگار مل گیا تھا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا جس میں کبھی چھٹی نہیں ہوتی۔ جس کے سامنے ٹِپس کی آمدنی اور پکار کوئی معنی نہ رکھتے تھے۔ وہ خوش تھا اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ یوں کھڑا تھا، جیسے وہ کسی کو نہیں، کوئی اسے ممنون کر رہا ہے۔ وہ جانا، ٹلنا نہ چاہتا تھا۔

"اچھا بیرا۔۔۔" درباری نے بے رحمی سے بیرے کو جھٹکتے ہوئے کہا، "ہم تھک گئے ہیں، دیکھو نا، کب سے چلے ہیں۔ اب تھوڑا آرام کریں گے۔"

"جی؟" بیرا بولا، "میری جرورت پڑے صاحب۔۔۔" درباری نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھادی۔ وہ سچ مچ تھک گیا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے سیتا کا ببّل کو دودھ پلانا برا لگ رہا تھا لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ کہتا تو برا لگتا، بہت ہی برا۔۔۔ جبھی اپنے کھلنڈرے پن میں ببّل نے کٹوری کو ہاتھ مارا اور دودھ نیچے گر گیا۔

"ہائے! گندا کہیں کا۔" سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا منہ پونچھنے اور پھر جھاڑن سے فرش صاف کرنے لگی۔ ببّل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ سیتا کی بانہہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ سیتا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی، درباری کچھ خجل سا نظر آنے لگا تھا۔

"یہ ہوٹل کوئی اتنا اچھا نہیں۔" وہ یونہی سی کوئی بات کرنے کے لئے بولا۔

"ٹھیک ہے۔" سیتا بے پروائی سے بولی۔ پھر درباری نے ناک سکوڑ کر ادھر ادھر

سونگھا اور کہنے لگا، ”کوئی بو سی آرہی ہے۔۔۔“ اور پھر اس نے پسینے کے قطرے اپنے ماتھے پر سے پونچھ ڈالے اور بولا، ”تم اب اسے چھوڑو بھی۔“سیتا نے ببّل کو بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تکلا ہو گیا۔ درباری نے ایک ایش ٹرے ببّل کے پاس لا رکھی اور ببّل اسے کھلونا سمجھ کر لپکا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھیلنے لگا۔۔۔ وہ کیا کرتا؟ پھر آگے بڑھ کر درباری نے ایک اناڑی، بے ڈھنگے، بھونڈے انداز میں سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”بھگوان کے لئے۔۔۔“سیتا بولی اور اس نے ببّل کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن درباری کی آنکھوں پر جیسے کوئی چربی چھائی ہوئی تھی، اسے کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک تروتازہ اور شاداب لڑکی۔ وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے جب اپنے بازو سیتا کے گرد ڈالے تو وہ گوشت پوست کے نہیں، لکڑی کے معلوم ہو رہے تھے اور سیتا کے نرم اور گداز جسم میں کھبے جا رہے تھے۔سیتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ درباری کی بانہوں میں کانپتی ہوئی وہ ہر لحظہ بے دم ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ آج وہ خود بھی بے سہارا ہو جانا

چاہتی تھی۔

ببّل نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا۔سیتا کو ابھی تک روتے دیکھ کر درباری کہہ رہا تھا، ”وہی مطلب ہوا نا۔ تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں۔“

”میں تم سے پیار نہیں کرتی۔۔۔؟میں تم سے۔۔۔“

ببّل نے ایش ٹرے کی راکھ منہ پر مل لی تھی اور اب رونے لگا تھا!

”چپ بے۔“ درباری نے نفرت اور غصہ کے ساتھ کہا۔سیتا چونکی وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی، لیکن۔۔۔ اس کے ہاتھ بازو جواب دے چکے تھے۔ درباری کی ڈانٹ کے بعد ببّل نے ڈر کر چلانا شروع کر دیا۔ درباری ایک دم آگ بگولا ہو کر لپکا جیسے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ مرد اور عورت کے بیچ اس بے آہنگ آواز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔ ببّل کے پاس پہنچتے ہی اس نے زور سے ایک تھپڑ ببّل کو مار دیا۔ ببّل لڑھک کر دور جا گرا۔

”شرم نہیں آتی؟“ کہیں سے مصری کی آواز آئی۔ درباری نے پلٹ کر

دیکھا۔۔۔ مصری نہیں سیتا تھی جو کسی ان جانی طاقت کے آجانے سے نیم برہنہ حالت میں اٹھ کر ببّل کے پاس چلی آئی تھی اور اسے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا تھا۔ ببّل سیتا کی چھاتیوں میں سر دیے رو رہا تھا، سسکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا منھ اٹھایا اور بندھی ہوئی گھِگھی کے باوجود درباری کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ اس نے مجھے مارا۔ درباری کو محسوس ہوا جیسے اتنے صاف سُتھرے کپڑوں میں بھی وہ گندہ ہے، وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا، جتنا ببّل سے۔۔۔ لیکن اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کی اس کے پاس ابھی بہت سی دلیلیں تھیں۔

جبھی درباری نے اپنا سر جیسے کسی دلدل میں سے اٹھایا اور ببّل کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سیتا کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ننگی تھی اور ببّل سے اپنے ننگے پن کو چھپا رہی تھی اور درباری کو دیکھ رہی تھی جیسے وہ دنیا کا سفلہ ترین انسان تھا جو اس کمینہ حد تک اتر آیا تھا۔۔۔ پھر اس کی نگاہیں خالی تھیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی!

شر مساری، ندامت اور خجالت سے درباری نے اپنا ہاتھ ببّل کی طرف بڑھایا اور سیتا کا بس چلتا تو وہ کبھی ببّل کو درباری کے گندے اور نجس ہاتھوں میں نہ دیتی۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ ببّل خود ہی بیتاب ہو کر درباری کے بازوؤں میں لپک گیا اور روتے ہوئے الٹا سیتا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو اس نے مجھے مارا۔۔۔ اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور نہ سیتا کے پاس۔

"سیتا!" درباری نے کہا۔ سیتا کچھ نہ بولی۔ وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ جلدی سے اس نے ساری کا پلو کھینچا اور اپنا جسم ڈھک لیا۔

"سیتا!" درباری پھر بولا، "تم کبھی۔۔۔ کبھی مجھے معاف کر سکو گی؟" اور پھر شک و شبہے کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، "ہم پہلے شادی کریں گے۔"

اور پھر اس نے ہمت کر کے اپنا دوسرا بازو سیتا کے گرد ڈال دیا۔ سیتا نے درباری کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر ایک جست کے ساتھ درباری سے لپٹ گئی اور اس کے کاندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں درباری

کے آنسو بھی شامل ہو گئے۔ دونوں کے دکھ ایک ہو گئے اور سکھ بھی۔۔۔ ان دونوں کو روتے ہوئے دیکھ کر ببّل نے رونا بند کر دیا اور حیرانی سے کبھی سیتا اور کبھی درباری کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔ جبھی ایکا ایکی وہ ہنس دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اپنے کرمرے کے لئے درباری کی مٹھی کھولنی شروع کر دی۔

لمبی لڑکی

آخر جب مُنّی سو ہی پانچ فٹ آٹھ اِنچ کی ہو گئی، تو دادی رُقمن نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"ارے!۔۔۔ میں تیرے لیے بَر کہاں سے گھڑا کے لاؤں گی؟" وہ اپنے ڈھائی بال نوچتے ہوئے بولی، اور اب کے سچ مچ روتی ہوئی وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے، بوڑھے اور بیمار پلنگ میں پیچھے کی طرف یوں جا دھنسی جیسے کُلھڑ سے پانی چھلک کر کچّی زمین میں کہیں گُم ہو جاتا ہے۔

مُنّی سوہی کیا جواب دیتی؟ اس نے پہلے اپنی طرف دیکھا اور پھر بے بسی میں دادی رُقمن کی طرف۔ جیسے وہ کہہ رہی تھی ۔۔۔ اس میں میرا کیا قصور؟۔۔۔۔۔۔ مُنّی تو اپنی لمبان سے آپ ہی شرمندہ تھی، جیسے جوانی کی ناگہانی یورش کے بعد ہر کنواری گھبرا اٹھتی ہے۔ کوئی پوچھے جب پیڑ پر پھل لگتے، پکتے ہیں تو کیا پیڑ گھبرانے، شرمانے لگتا ہے؟

پلنگ کے پاس اخروٹ کی ایک تپائی رکھی تھی جس پر عقیدت کے رنگوں سے کڑھا ہوا ائیر ٹیکس کا ایک کپڑا پڑا تھا اور اس کے اُوپر پانڈووں کے زمانے کی، پرانے چھاپے کی ایک گیتا، جس کے پنّے کھلے ہوئے تھے اور ہَوا میں اُڑ رہے تھے۔ گیتا ہمیشہ دادی کے سرہانے پڑی رہتی۔ ہاں، دادی کا کیا پتہ؟ اب ہو تب نہ ہو۔ بیاسی برس کی عمر تھی اس کی، اور جہاں گھر اور اس تیلی محلّے کے لوگوں کی بے آسی بڑھتی جا رہی تھی، دادی ماں کی اُمّیدیں جوان ہو رہی تھیں۔ وہ کچھ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی اور بیاسی سال اور جینا چاہتی تھی، جیسے ابھی کوئی سواد نہیں آیا۔ آیا ہے تو ابھی آیا ہے۔ اس کی دُھندلی مگر بے چین آنکھیں نہ معلوم اور کس وچتر

گھٹنا کو ڈھونڈتی تھیں؟ مُنہ کس ذائقے، چٹخارے کی تلاش میں تھا؟ اس کا چہرہ پیڑ پر سے گرے ہوئے پیپل کے پتّے کی طرح تھا، جس میں رگوں اور ریشوں کا ایک جال سا نظر آتا تھا، ہریالی کہیں نام کو نہ تھی۔

دادی رُقمن کی ہریالی کہیں نہ کہیں ضرور اٹکی ہوئی تھی۔ دورے کے سمے وہ کھانستی۔ ہوا سے ہوا ہی میں، ہوا کی تھیلیاں بھرتی، فضا میں پھواریں چھوڑتی ہوئی، بے دم، بے سُدھ ہو کر پیچھے کی طرف لُڑھک جاتی۔ آنکھوں کی پُتلیاں اُوپر کی طرف سمٹتی ہوئی دسم دوار کو دیکھنے لگتیں۔ پر ان پانچ چکروں میں سے نکل کر چھٹے میں چلے آتے گلے کا گھنگھرو بجنے لگتا۔ بھابی شیلا پیٹی کوٹ ہی میں بھاگی آتی۔ دادی کو آخری سواسوں میں دیکھ کر آنکھیں پھیلاتی، چلّاتی ۔۔۔ "ہائے! کوئی ان کو خبر کرو۔۔۔" مُنّی سوہی دوڑتی۔۔۔ روتی، پکارتی ہوئی۔ "باپو! کہاں ہو؟۔۔۔ دادی گئی!" اور پھر دادی سے لپٹ جاتی۔۔۔ "دادی، میں بے ماں کی بیٹی۔۔۔ مجھے چھوڑ نہ جانا۔۔۔"

اور پھر بھابی شیلا اور مُنّی سوہی مل کر گیتا کے سترھواں ادھیائے کا پاٹھ شروع کر

دیتیں۔ سماپتی کے بعد اس کا پھل داری کے نمت دینے لگتیں تا کہ دادی کی جان آسانی سے نِکل جائے۔ ایک تو ویسے ہی موت کے وجود کا احساس، اس پر آوازوں میں ڈرتا، کانپتا ہوا اُترنّم۔۔۔ پوری فضا میں ایک ڈراؤنی، گھناؤنی سی جھنکار پیدا ہو جاتی۔ پھر ایکا ایکی کوئی شُونیہ، جس سے گھبرا کر مُنّی پکار اُٹھتی۔۔۔ ''دادی ی ی ی ی۔۔۔'' اور اس کی آواز چو کُوٹ گُونج جاتی۔ جبھی بھابی بڑھیا کے بھاگ ہین ماتھے، کرم ہین ہاتھ اور چر تر ہین شریر پر ہاتھ دوڑاتے ہوئے کہتی۔۔۔ ''گئی!'' اور پھر۔۔۔ ''ارے کوئی نیچے اُتارو، دَیا کرو، بے گتی، مر گئی تو خرچا ن کون کرے گا؟ کون پنڈتوں کو روپے پوجے گا؟ سترہ روپے نو آنے تو خالی یہاں سے ہر دوار کا کرایہ ہے۔۔۔''

اور دادی کو یُوں گھسیٹ کر پلنگ پر سے نیچے پھینکا جاتا، جیسے مَیلے غلاف کو سرہانے سے اُتار کر دھُلائی میں پھینکتے ہیں۔ اسے زمین پر ڈالتے ہی مُنّی سو ہی رسوئی کی طرف لپک جاتی، اور تھوڑی دیر کے بعد آٹے کا دِیا، دِیے میں گھی اور گھی میں رسی بسی روئی کی بتّی اور ہاتھ میں ماچس لیے آتی۔ گھبراہٹ اور ہوا میں جلدی

جلدی دو چار تیلیاں پھونکتی ہوئی دِیا جلاتی۔ دادی کو روشنی دکھاتی تاکہ بھنور گپھا میں بھی جائے تو ٹھوکر نہ کھائے۔۔۔ہاتھ پر دِیا رکھنے کے بعد مُنّی ڈری سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی ہو کر بھابی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے، ہری اوم، ہری اوم کا جاپ کرنے لگتی اور پھر گائیتری کا سہارا لیتی۔۔۔ ''اوم بھُور بھوا سواہ۔۔۔

''جب شیلا بھابی کو یقین ہو جاتا بُڑھیا کے سواس نکل چکے ہیں، تو وہ زبردستی کے آنسو بہانے لگتی۔ ہاں مُنّی کے آنسو سچّے موتی ہوتے۔ دادی کے سِوا اس کا سہارا تھا کون؟ ماں گئی، اب دادی بھی گئی تو اس کی پرتیت کون کرے گا؟ اس کے اس جھوٹ کی گواہی کون دے گا جو ہر عورت، ہر کمزور مرد کو بولنا ہی پڑتا ہے۔ پھر اس کے الھڑ سے تِریا چرتّر پر کون پردے ڈالے گا۔۔۔؟ شادی تو ہو گی نہیں۔ کون لڑکا دیکھنے کے لیے گلی محلّے کے ہر آتے جاتے کے پیچھے پڑے گا؟ پھر اتنا لمبا لڑکا ملے گا بھی کہاں سے؟ چھوٹے قد کا کوئی بیاہے گا نہیں۔ بیاہے گا تو بسائے گا نہیں۔ مگر دادی رہے گی بھی تو کب تک؟ اس سنسار کے بَھوساگر کی تو کوئی تھاہ ہی نہیں کوئی دوسرا کنارہ ہی نہیں۔ کون انگلی پکڑے گا؟ کون پار کرائے گا؟

دیو بھیّاہیں تو اپنی ہی موج، اپنی ہی بہار میں رہتے ہیں۔ سنتے ہیں یہاں سے دو تین بازار پرے، کرم روگ والے اسپتال میں کوئی نرس ہے، جس کے ساتھ رات جاگتے ہیں۔ پہلے تو گھر آتے ہی نہیں، آتے بھی ہیں تو مُنہ سے، شریر سے بھبھکے چھوٹ رہے ہیں۔ کچھ شراب کے، کچھ نرس کے۔ یوں بھیّا کو نشہ کم ہوتا ہے، پر یہ ثابت کرنے میں کہ انہوں نے نشہ کیا ہی نہیں، پکڑے جاتے ہیں۔ ہاں، بِن پیے بھلا کون ہے جو یوں دِھیرے دِھیرے لِٹکاڑکا کر پیَر زمین پر رکھتا ہے؟ آدمی، آدمی ہوتا ہے۔ کوئی مور تو نہیں۔ پھر زیادہ ہنستے ہیں، نہ خفا ہوتے ہیں۔ آخر بھابی سے جنگ ہوتی ہے۔ وہ اسے نل کے چوبچے میں پٹخ دیتے ہیں۔ وہ جھوٹے برتنوں میں سے کانسی کا طباق اُٹھا کر ان کے سر پر دے مارتی ہے۔ وہ سوال میں مارتے ہیں، یہ جواب میں دانتوں سے کاٹتی، ناخنوں سے نوچتی ہے۔ جانے یہ عورت مرد کا ناتا ہی مار پیٹ کا ہے۔۔۔

پھر برتن گلی میں پھینکنے جاتے ہیں۔ جو برتن نہیں رہتے، ایک طرح کا نیوتا بن جاتے ہیں۔ کیا بڑے اور کیا چھوٹے، گلی کے سب اس گھر میں آدھمکتے ہیں۔ بڑی

بڑی نصیحتیں، بڑے بڑے بھاشن دیتے ہیں۔ لڑائی کیا چکاتے ہیں، اور جھگڑا بڑھاتے ہیں۔ بھلا لڑائی چکانے میں کوئی اپنی آستینیں بھی چڑھاتا ہے۔۔۔؟ اندر سے وہ کتنے خوش ہوتے ہیں، یہ آپ بھی نہیں جانتے۔ پھر کپڑے پھاڑے جاتے ہیں۔ پہلے تو بھابی بے پردہ ہو جانے کے ڈر سے ہار مانتی ہوئے اندر بھاگ جاتی تھی۔ پر ایک دن ایسا آیا کہ وہ سب کے سامنے کھڑی تھی۔۔۔ ننگی، اس پر دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے، مجسٹریٹ کی طرح۔۔۔ ہے رام! ایک پہناوا بھگوان دیتا ہے، دوسرا انسان۔ انسانوں میں رہنا ہے تو ان کا پہناوا پہننا ہی پڑے گا اور بھابی۔۔۔ انسان میں بھگوان کا پہناوا پہنے کھڑی تھی۔۔ پڑوس میں جینیوں کے دو خاندان ہیں۔۔۔ شویتامبر جین اور ڈگامبر۔۔۔ اس دن شویتامبروں کی دونوں بہوئیں آئی تھیں اور شرم سے پانی پانی ہوتے ہوئے بار بار اپنے مُنہ دھوتی کے پلّو سے ڈھک رہی تھیں۔ ان تک بات رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ڈگامبروں کے سُوکھم مُنّی بھی وہیں تھے، جو بھابی کے اس رعب داب کو دیکھ کر بھاگے۔ لوگ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہیں نا۔۔۔؟ سُوکھم مُنّی پانو پر سر رکھ کر بھاگے۔

دروازے کے دہلیز کے ساتھ ٹکرائے، پھر لوٹ کے آئے۔۔۔ پھر گئے سو گئے۔ کیڑوں مکوڑوں سے راستہ صاف کرنے والا ان کا بہارُو بھی وہیں رہ گیا۔ ناک کا کپڑا بھی گر گیا۔ نہ معلوم کتنے جیو جنتُو ان کے پاؤں تلے آکر ہنسا ہو گئے ہوں گے، اور کتنے ناک کے راستے اندر چلے گئے ہوں گے؟ بھابی کو کتنا پاپ لگا ہو گا۔ جب سارے جھگڑے بھول کر دیو بھیّا اس پر دری پھینکتے، گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔۔

یہی بھابی پہلے بات بات پر مائیکے کی دھمکی دیا کرتی تھی، جھٹ سے لہنگا سنبھالتی، اِکّا منگواتی اور چل دیتی۔ پر، اَنت میں وہ سمجھ گئی۔ اب اِکّا نہیں، دھکّا بھی ملے تو وہ نہیں جاتی۔ کیوں جائے؟ گھر عورت کا ہوتا ہے۔ مرد مسافر اس بات کو کیا جانیں؟ اس کا باہر ہوتا ہے، اس لیے وہی جائے۔۔۔ دوسری طرف باپو ہیں۔ جب پولیس میں ڈپٹی تھے تو کیا کھڑ کا دڑ کا تھا ان کا۔ مجال ہے جو گھر میں دیر سے بتّی جلے، کھانے میں نمک زیادہ پڑے۔ ایسے میں تھالی سُدرشن چکر کی طرح گھومتی، ٹنٹناتی ہوئی آنگن میں ہوتی تھی، کٹوریوں سمیت اور ایسی گالیاں سننے میں

آتیں جو چوک میں بھی نہ بکی جاتیں۔ اُدھر ماں گئی، اِدھر باپو کو نہ جانے کیا ہوا؟ ایسی اُداسی پکڑی جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ جیسے کوئی بان پر ستھ لے لیا۔ عورت کا راج اپنے مرد سے ہوتا ہے، تو مرد کا بھی عورت ہی سے ہوتا ہے۔ اب وہ صبح سویرے نکل جاتے ہیں اور سیم والی نہر کے پاس اکھاڑے کے بغل میں ایک پھکل، پاکھنڈی مہاتما سے تلسی جی کی چوپائیاں سنا کرتے ہیں۔ یا وہ مہاتما ٹھیک سے ارتھ نہیں کر پاتے، یا باپو اپنے مطلب کا مطلب نکال لیتے ہیں اور پھر اُداس ہو جاتے ہیں۔ رات گھر آتے ہیں تو چوروں کی طرح۔ پیر سنبھال کر زمین پر رکھتے ہوئے۔ گھر بھر میں ڈر کے مارے کوئی ان سے کچھ نہیں کہتا۔ اکثر تو کوئی کھانا بھی نہیں پُوچھتا۔ جب بولا کرتے تھے تو کوئی جواب بھی دیتا تھا۔ اب وہ چُپ ہیں، تو سارا اسنسار چُپ ہے۔ سبھی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ بان پر ستھ لیا تو سنیاس بھی لے سکتے ہیں، پھر پنشن گھر میں نہ آئے تو گزارہ کیسے ہو گا۔۔۔؟ بھیّا کی سائیکلوں کی دُکان تو چلتی نہیں۔ نرس کے لیے جو بیچ میں گول مال کیا تھا، اس کے کارن ایک دن بیٹھے بٹھائے ان کی ایجنسی بند ہو گئی۔

بھیّا یوں نہیں آتے، باپو گھر میں نہیں رہتے۔ اب یہاں عورتوں کا راج ہے۔ ہم عورتیں سبھی راج کی اِچھّا کیا کرتی ہیں، پر جب مل جاتا ہے، تو سر پیٹ لیتی ہیں۔ نا بابا! ایسا راج کسی کو نہ ملے۔ وہ گھر ہی کیا جس میں مرد نہ آئے، حکم نہ چلائے، ہر روز کوئی نیا جھگڑا فساد نہ مچائے۔ عورت بیرن آخر تو مرد ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ مرد کیا ہے۔۔۔؟ دادی سے پوچھو، بھابی سے پوچھو۔۔۔۔ سامنے والے شاہد میاں کی آپا سے پوچھو، مجھ سے۔۔۔ پر میرا تو وہ آئے گا ہی نہیں۔ آئے گا تو بھی چلا جائے گا۔ تیاگی جات کی ہم عورتوں کی قسمت ہی ایسی ہے۔۔۔

جبھی شیلا بھابی کو دادی ماں کا ماتھا گرم دِکھنے لگتا۔

"یہ تو" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہتی۔۔۔ "جی رہی ہے۔"

مُنّی سو ہی چھٹپٹا کے لمبے لمبے ہاتھ پیر مارتی ہوئی سوچ بچار کے ہچکولوں سے نکلتی اور لپک کر دادی ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی، جو اسے اپنی جوانی اور اس کی گرمی کے کارن ویسے ہی برف کا برف معلوم ہوتا اور پھر تھوڑا گرم۔ جبھی دادی کا

کانپتا ہوا ہاتھ زندگی کی تائید میں اُٹھ جاتا۔ سوہی مری مری جی اٹھتی، شیلا جیتے جی مرجاتی۔

''دادی کو اوپر ڈالو، شیلا بھابی'' مُنّی چلّاتی۔

بھابی ماتھے پر سات ٹھیکرے پھوڑتی ہوئی کہتی ''تم ڈالو تو ڈالو۔۔۔ مجھ سے نہیں اٹھائی جاتی یہ گیلی لکڑ۔''

مُنّی اپنے لمبے چوڑے کلاوے میں دادی کو اُٹھاتی اور پھر سے پلنگ پر لٹا دیتی۔ کوئی ہی دیر میں رُقمن بولنے جوگی ہو جاتی۔ ہوش میں آتے ہوئے جس پہلے شبد کا اُچار سُنا کرتی وہ ''مُنّو'' ہوتا، جس کے جواب میں مُنّی بھی ہمیشہ بڑھیا کو پچکارتے ہوئے بول اُٹھتی۔۔۔ ''ودیا!'' جبھی ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے دادی مُنّی ہے اور مُنّی دادی۔ دراصل مُنّی اور دادی ایک دوسری کی طرف چلتی ہیں، تو بیچ میں کہیں ایسے موڑ، ایسے نکّڑ پہ مل جاتی ہیں، جہاں ماں کھڑی ہوتی ہے، جو کبھی اپنے آپ بوڑھی ہو جاتی ہے اور کبھی بچّی۔ بچّی ہو یا بوڑھی، عورت سے ماں پنے کا

الزام تو ٹل ہی نہیں سکتا۔ وہ اس کے مَل موت میں جیتی، اس میں مر جاتی ہے اور مر دوے یہی سمجھتے ہیں۔۔۔اس کی آئی تھی اس لیے چلی گئی۔۔۔

"تُو نے مجھے پُکارا نا" دادی، مُنّو سے پوچھتی۔

"نہیں تو" مُنّی جواب دیتی "میں نے تجھے نہیں پکارا۔"

دادی سرزنش کے انداز میں اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہتی ۔۔۔ "دیکھ۔۔۔ میں نے تیرے باپ کو جَنا ہے" اور پھر۔۔۔ "میں سب جانتی ہوں تیرے چلتّر۔ عورت میں چار سو چار چلتّر ہوتے ہیں، پر تجھ میں چار سو پانچ ہیں"!

اس پیاری سی پھٹکار کے بعد مُنّی تھوڑا اور بھی دادی کے پاس سرک آتی۔۔۔ "تیری سوں دادی" اور پھر ایکا ایکی مُنّی کو یاد آ جاتا۔۔۔ ہاں، ہاں، بے بس ہو کر اس نے دادی کو آواز دی تھی۔ شاید۔۔۔ یہی آواز تھی جو کھنڈوں، برہمنڈوں کو چیرتی ہوئی دادی تک جا پہنچی اور اسے پھر اس سنسار میں لے آئی۔ پر مُنّی جانتی تھی، اوپر جاتی ہوئی دادی بھی تو مڑ مڑ کر نیچے دیکھتی ہو گی۔ وہ جانا نہیں چاہتی

تھی۔ ابھی کچھ کام تھے جو ادھورے رہ گئے تھے، جنہیں وہ نپٹانا چاہتی تھی۔ مُنّی آخر مان جاتی۔۔۔۔ ”ہاں دادی! میں نے پُکارا تھا۔۔۔ میری اور سُنتا کون ہے؟“

گلی محلّے کی کچھ عورتیں مزاج پُرسی کے لیے آجاتیں۔ شیلا بھابی کچھ دیر کھڑی رہتی اور پھر دادی پوتی کے بیچ یہ انوکھی عشق بازی دیکھ کر، ناک بھوں چڑھاتی ہوئی اندر، رسوئی بھنڈارے کی طرف چل دیتی۔

دادی رُقمن پھر اُٹھنا چاہتی۔ بڑھاپے میں اور تو سب چیزیں انسان اُٹھالیتا ہے، پر اپنے آپ کو اٹھانا بڑا مشکل ہے۔ اصل میں بوجھ شریر کا نہیں ہوتا، من کا ہوتا ہے۔۔۔ دادی جو کوئی ہی دیر پہلے مر رہی تھی، عورتوں کی مدد لینے سے انکار کر دیتی۔ مُنّی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو بھی جھٹک دیتی اور اُٹھ کر بیٹھ جاتی اور مُنّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ـــ

”یہی میری دشمن ہے، گلُّو کی ماں۔“

گلُّو کی ماں قریب ہوتے ہوئے پوچھتی ”کیوں ماں۔۔۔ مُنّی کیسے دشمن ہو گئی؟

"

"میں اچھّی بھلی جارہی تھی" دادی رُقمن کہتی "اس سُڑنّی نے نہ جانے دیا۔"

پیار سے دی ہوئی اس گالی سے مُنّی کے سارے چھوٹے موٹے ڈر، سب دُکھ دلدّر دور ہو جاتے۔ ایسے میں دادی دشمن کی بجائے مُنّی کو سجّن کہہ دیتی تو کیا ہوتا؟ پھر دادی کو وہ سارے درِش یاد آجاتے جو اس نے تھوڑی دیر کی موت میں دیکھے تھے۔۔۔

"کتنی سندر باٹکا تھی، جمنا!" وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہتی۔ جیسے اب پھر باٹکا دکھائی دے رہی ہو۔۔۔ "چھوں اور ہری بھری بیلیں اور ان بیلوں میں پھُول، ان پھُولوں میں پرکاش، جس میں بڑے بڑے رشی مُنی بیٹھے اکھنڈ کیرتن کر رہے تھے۔۔۔"

گلّو کی ماں، جمنا، مُنّی سب شردھا سے سننے لگتیں۔ دادی کبھی آہستہ، کبھی تیز اندر کا سب وگیان لٹانے لگتی۔۔۔ "کروڑوں سورجوں کا اُجیالا۔۔۔ پھر گرمی نام کو

نہیں۔ ایسی ٹھنڈک جو دگدھ سے دگدھ من کو ہرا کر دے۔ ایسا سکھ پہنچائے جو کہنے میں نہ آئے۔۔۔

بس ایک ہی آگ تھی جو بار بار میری اَور لپک رہی تھی۔۔۔"

"آگ۔۔۔؟ آگ کیسی ماں؟"

دادی مُنّی کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہتی "اس نُپوتی کی آواج۔۔۔"

جمنا بول اُٹھتی "پر آواز تو شبد ہوتی ہے، دادی۔۔۔"

"مورکھ ہونا" دادی جھلّا کر جمنا سے کہتی "اِتنا بھی نہیں معلوم؟ انتر میں شبد اور پرکاش میں کوئی بھید نہیں ہوتا۔"

"دھنیہ ہو" جمنا کہتی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کر دیتیں۔

"دھنیہ ہو دادی" باقی کی بھی پُکار اُٹھتیں۔

اور پھر دادی برابر بولتی جاتی، جیسے کوئی چابی لگ گئی یا جیسے کوئی دیر پہلے کی چُپ کا

گھاٹا پُورا کر رہی ہو۔ پھر اس عمر میں جب کوئی کسی کی نہیں سنتا، جمنا اور گلو کی ماں کے سے شر وتا مل جائیں تو اور کیا چاہیے ؟ ان سب کو زور زور سے سر ہلاتے دیکھ کر مُنّی ڈر جاتی۔ پہلے بھائی اور بھابی کے جھگڑے کے کارن گھر بھر لوگوں کو آر جار کا کیندر بنا ہوا تھا، اب دادی کے دیوی بن جانے کی وجہ سے۔ جب اور بھی عورتیں آنے لگتیں تو چار سو پانچ چھتّر والی مُنّی دادی کی بات کاٹ دیتی۔۔۔

”اچھّا دادی۔۔ وہاں سُرگ میں تجھے دادا نہ ملے؟“

ایکا ایکی دادی کے ڈال پر سے گرے ہوئے، سُوکھے پتّے کے رگوں اور ریشوں میں ہریالی دوڑ جاتی۔ اور نو بیاہتا کی طرح وہ شرماتے ہوئے کہتی۔۔۔ ”ملے کیوں نہیں ری مُنّی؟“

یک دم پانسہ پلٹ جاتا۔ وہی عورتیں ایک دوسرے کے کولہے میں ٹھوکے دینے لگتیں اور اشارے اشارے میں کہتیں ”سنو، سنو۔۔۔“

”تب وہ کیا بولے؟“ مُنّی پُوچھتی۔

”پیڑوں کی لسّی مانگ رہے تھے۔“

مُنّی، جمنا اور گُلّو کی ماں اور دوسری عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی ”دادا جی کو بہت پسند تھی پیڑوں کی لسّی“ اور پھر دادی سے بولتی ”کیا وہاں سُرگ میں پیڑے بھی نہیں، وَدیا؟“

”پیڑے بھی نہیں، کھٹی کڑھی بھی نہیں۔“

۔۔۔ کھٹّی کڑھی دادی کو بہت پسند تھی!

”ایسے سُرگ میں جانے کا کیا فائدہ؟“ مُنّی کہتی۔

”وُہی تو“ دادی اپنے بھول پنے میں جواب دیتی ”کل تم دیول کے پجاری جی کو نیوتا دینا اور ساتھ پنڈت رلیا رام کو بھی۔ خوب کھانا کھلانا اور پیٹ بھر کے پیڑوں کی لسّی پلانا۔۔۔“

عورتیں اپنی ہنسی دباتیں۔ مُنّی کہتی ”ہاں دادی۔۔۔ یہ کوئی سُرگ تھوڑے ہے،

جہاں پیڑے بھی نہ ہوں۔۔۔"

اور دادی سامنے دیکھتے ہوئے بولتی جاتی "کیسے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔۔۔ مندر کی ہیروں جواہروں سے جڑت مڑت چوکھٹ میں۔ ویسے ہی شیر جوان، یہ چوڑی چکلی چھاتی، لَٹ لَٹ کرتا ہوا چہرہ۔ اس پر یہ بڑے بڑے مونچھوں کے کالے گچھے۔۔۔

"کالے گچھے؟" مُنّی کہتی "ابھی تک ان کی مُونچھیں کالی ہیں؟"

دادی پوپلے منہ کے ساتھ تھوڑا ہنس دیتی۔۔۔ "پاگل ہے نا۔۔۔ کال بھگوان کا مار وہاں تک نہیں پہنچتی، مُنّو! وہاں جوان بوڑھے نہیں ہوتے۔ میں نے دیکھا ان کے پاس ایک سُندر، سجل لڑکی تھی۔ کیا رُوپ تھا اس پر۔۔۔"

"کیا بات کر رہی ہو ودیا؟" مُنّی بول اُٹھتی "وہاں بھی دادا۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ یہ بھی تو پوچھ وہ تھی کون؟"

”ک۔۔۔۔کون؟“

”وہ میں تھی۔۔۔۔جب بیاہی آئی تھی۔“

اس پر سب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہونے لگتیں۔ ان کی ہنسی نہ سنائی دیتی تو دادی کو۔ اور وہ کہے جاتی میرا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ”تم آ جاؤ۔۔۔رُقمن۔۔۔اب نہیں رہا جاتا۔۔۔“

یہ عورتوں کے صبر کی حد تھی۔

دادی بولتی۔۔۔ ”میں نے ہاتھ چھڑا لیا۔ کہا، میں ابھی نہیں آسکتی، جگّن کے پتا! ابھی کوئی دیر اور میری راہ دیکھو۔ مجھے دنیا میں بڑے کام ہیں۔۔۔“ اور دادی کے چہرے پر کی نہروں اور جھیلوں میں جھر جھر بہتے پانی کو دیکھ کر عورتیں ایک دم چُپ ہو جاتیں۔ دادی ایک ہاتھ تپائی پر پڑی ہوئی گیتا پہ رکھ دیتی اور دوسرے سے دھوتی کا پلّو تھامتی آنکھیں پونچھتی ہوئی، ایک جیوتی ہین نگاہ مُنّی پر ڈالتی اور بلبلا اُٹھتی۔

"ہائے ری سوہی۔۔۔ تو کیسے سوہے گی؟"

اس ایک ہی بات میں باقی کی عورتوں کا اندر بھی پانی ہو کر آنکھوں میں چلا آتا۔ آخر وہ اُٹھتیں، ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتیں "دھنّیہ ہو دھنّیہ ہو ماں" کہتی ہوئی ایک ایک کر کے چل دیتیں۔۔۔

جگن ناتھ تیاگی اور ان کے بیٹے دیویندر تیاگی کے مکان ڈپٹی بھون میں کالے بھی آئے اور گورے بھی آئے۔ پر مُنّی سوہی کے رنگ کا ایک نہ آیا۔ اس کے قد کاٹھ کا کوئی نہ پہنچا۔

مُنّی سوہی، خالی خولی لمبی ہی نہ تھی، بدن بھی بھرا ہوا تھا اور اس کا رنگ اپنے ہی لہُو کی آگ میں جلتے رہنے سے تانبے کا سا ہو گیا تھا۔ کبھی تو وہ کونارک کے مندر کی، تانترک شلپیوں کے ہاتھ سے بُنی ہوئی، بڑی سی یکشی معلوم ہونے لگتی اور کبھی ایک بڑی سی دیگ، بیاہ شادیوں میں جس میں حلوہ یا اُرد پکائے جاتے ہیں اور جس کے نیچے برابر کی آنچ کے لیے منوں ہی لکڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں، اور پھر کیا

حلوہ بنتا ہے، کیا اُڑد ہوتے ہیں۔۔۔ گلی بازار میں نِکلتی سو ہی تو اپنے آپ سے بھی ایک فٹ آگے چلتی، جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔ ہٹ جاؤ، میں آ رہی ہوں۔ لوگ راستہ دے دیتے، پچھاڑیں کھا کھا کر پیچھے گرتے، جیسے ڈپٹی جگن ناتھ کی نہیں، کسی راجا کی بیٹی ہو!

تیاگی کُل کی سب بیٹیاں ایسی ہی ہوئیں۔ چھ چھ فٹ کی اور بیٹے چھوٹے اور بے بضاعت سے۔ سب بیٹیوں کی شادی میں یہی مصیبت ہوئی۔ یہی خلجان۔ اُوپر تین چار پشت میں کوئی ایسی بہو آئی کہ پورے کُل کی تباہی لے آئی۔ ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رُکنے کا نام ہی نہ لیا۔ دادا پہلے آدمی تھے، جنہوں نے خاندان کو اس بربادی سے بچانے کی کوشش کی۔ دادی چھوٹے قد کی لائے۔ مطلب، اپنی بیوی۔ مُنّی کی دادی خود مُنّی کی ماں پیچ کے قد کی تھی۔ دیویندر کی بیوی شیلا بھی ناٹی بلکہ بونی۔ دادا کے حساب سے اس پشت میں اولادوں کے ٹھیک ہونے کی امید تھی۔ پر شیلا نے موتی تو دبوچ ہی لیے، لعل بھی نہ اُگلا۔ سب ڈرتے بھی تھے نا کہ بیٹیاں چھوٹے قد کی ہوئیں تو بیٹوں کا کیا ہو گا۔۔؟ پر اس وقت تو مُنّی کا سوال

تھا، جو اب پانچ فٹ نو انچ کی ہو گئی تھی۔

کئی گرمیاں آئیں اور کئی گئیں۔ کتنی سردیوں نے شل کیا۔ بہاریں گئیں اور پت جھڑیں بھی۔ سامنے شاہد بھیّا کے مکان کے پاس جو کچنار کا پیڑ لگا تھا، اس نے کئی ہرے اُودے کوٹ پہنے اور اُتار بھی دیے۔ ڈپٹی بھون کے باہر بڑھاؤ کے نیچے جو شہتیری ڈالی تھی، اس میں جھُریاں بھی چلی آئیں۔ برسات آٹھ آٹھ، سولہ سولہ، بتیس بتیس آنسو روئی اور نئے مکانوں پر ہری اور کالی کائی چھوڑ کر جیسے اپنی سسرال چلی گئی۔ پر مُنّی وہیں تھی۔۔۔

تیلی محلّے کی رونق، شام گلی کا مذاق۔۔۔ اب کے سال جو گرمی پڑی تو حد ہی ہو گی۔ برسوں میں ایسا اُمس کبھی نہ ہوا تھا۔ جمنا کی دونوں گائیوں کا دودھ تھنوں میں سوکھ گیا۔ پہاڑوں پر چلے جانے کے کارن، گُلّو کی ماں کے گھر اُلّو بولنے لگے۔ دن کی روشنی میں اُڑنے لگے۔۔۔ دھرتی سے غبار اٹھتے اور اپنے دماغ، آسمان پر چھا جاتے۔ بادل آتے بھی تو گرجے برسے بِنا ہی نکل جاتے، جیسے کسی بگیا کی سیر کرنے آئے ہوں۔ ایک دُھول سی تھی، جو ہر وقت چھائی اور عقل کو ماؤف کیے

رہتی۔ اس مٹی اور گرد سے یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے دھرتی آسمان کی طرف اُچھل رہی ہے اور آسمان دھرتی کی طرف لپک لپک جاتا ہے۔ اس حبس اور حبس میں ایسی لپک جھپک سے یہ پتہ چلتا، جیسے پوری کائنات کو اختناق ہو رہا ہے۔

اور تو اور، آپا فردوس، شاہد کی بہن جو دو سال سے بھائی کے گھر بیٹھی تھی، چلی گئی۔ دولھا بھائی نے پیر پکڑے، معافیاں مانگیں، توبہ میں کان لال کیے اور آپا کو لے گئے۔ شاہد کوئی ایسے ہی تھوڑے بھیجنے والے تھے۔ بیچ میں اس قاضی کو بھی لے آئے جس نے نکاح پڑھوایا تھا اور حق مہر باندھا تھا۔ آپا فردوس کے رخصت ہوتے وقت مُنّی اتنا روئی کہ تالاب بھر گئے۔ آپا نے بہت پیار کیا، بہت تسلی دی اور کہا۔۔۔ "میں پھر آؤں گی۔ مُنّو۔۔۔ تیری شادی پر تو انشاء اللہ ضرور آؤں گی۔" منی سوہی نے فریادی نظروں سے آپا فردوس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "تب تو آئی آپا"!

ڈگامبروں کی بہُو ترمبکا بائی نے کہا۔۔۔ "سہیلی کے جانے پہ تھوڑی کوئی اتنا روتا ہے؟" جب مُنّی نے اپنے آنسوؤں کو خون بنایا اور پی گئی۔۔۔ پر دادی تھی جو

خون کو آنسو بناتی رہتی۔ شیلا اب اس سے تنگ آچکی تھی۔ اس لیے بھی کہ دادی اب پلنگ ہی پر چادر گیلی کر دیتی۔ دیویندر کتنا بھی شرابی کبابی تھا، مگر دادی سے پیار کرتا تھا۔ پیار مردوں کو سستا پڑتا ہے، اس لیے کہ مرنا نہیں پڑتا۔ بس خالی خولی ہمدردی جتائی، دنیا کی نظروں میں، اپنی نگاہوں میں اچھے بنے اور چل دیے۔ دادی کے پلید کیے ہوئے کپڑے مُنّی دھوتی تھی۔ اس پر بھی شیلا ناک پہ دوپٹہ رکھے ہوئے اندر آتی، باہر جاتی۔ دیویندر کو یہ نظارہ بہت نک چڑھا معلوم ہوتا۔ ایک دن وہ بولا۔۔۔

"تم چاہتی ہو دادی مر جائے؟"

"ہاں" شیلا بے جھجک بولی۔

"اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

"کیا طریقہ؟"

"مُنّی کا بیاہ کر دو۔"

شیلا سٹپٹا گئی۔ ”میں تو کہتی ہوں، دادی بھی جائے اور اس کی پوتی بھی۔ مجھ سے اب کسی کے مرنے نہیں مرے جاتے“ اور پھر بولی ”کل بہن تمہاری اونچی ایڑی کا جوتا دیکھ رہی تھی۔۔۔ میں تو کہتی ہوں پہنے۔ سر بادلوں میں چھُپائے، کہیں اُوپر کی اُوپر چلی جائے۔“

دیویندر چُپ رہا۔

”اور نہیں تو کیا“ شیلا پھر بولی ”دونوں کے لیے جم راج کیا مجھے ڈھونڈنے ہیں؟“

جم راج ڈھونڈنے کی ذمے داری چونکہ دیویندر کی تھی، اس لیے وہ کچھ نہ بول سکا۔ وہ طبیعت ہی سے کام چور تھا۔ ہر قسم کی ذمّے داری سے گھبراتا تھا۔ جو کام اپنے آپ ہو جائے، سو ہو جائے۔ اپنے پتا جگن ناتھ کی طرح وہ بھی اپنی اس کاہلی اور بے عملی کے سلسلے میں شاستروں اور پرانوں کی مدد۔۔۔ مانس کا سب جتن چُترائی ہے۔ بھگوان نے کہا ہے، تم پُورے طور پر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ تمہارے سب کارج سدھ ہو جائیں گے۔۔۔

کام ہو گا یا نہیں ہو گا، اس لیے پچاس فی صدی کے تناسب سے ایسے لوگوں کے کارج سِدّھ ہو بھی جاتے ہیں۔

دیویندر برآمدے سے اُٹھا، صحن میں آیا۔ ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا، جہاں بادل گھر آئے تھے۔ کیوں نہ آتے؟ یہ موسموں کا چکّر بھی ایک سائیکل ہوتا ہے۔ سردی کے بعد گرمی، گرمی کے بعد برسات، اُوپر بھی کبھی کسی گول مال سے ایجنسی بند ہو جاتی ہے۔۔۔ اُدھر برسات کی پہلی بُوند گری، اُدھر گوتم، دیویندر کے بچپن کا دوست کلکتہ سے چلا آیا، جہاں اس کے پاس ہند سائیکلوں کی ایجنسی تھی اور اب یہاں دیناپور میں سب ایجنسی قائم کرنے آیا تھا۔

گوتم قد کے اعتبار سے مشکل سے پانچ فٹ دو اِنچ کا ہو گا۔ لیکن تن و توش کے اعتبار سے اچھا تھا۔ آکا باکا سا چہرہ۔ لال رنگ۔ معلوم ہوتا تھا گالوں میں دو ٹماٹر دبا کے رکھے ہیں۔ بات بات پر اُچھلتا، جیسے نہ جانتا ہو اس صحت کا کیا کرنا ہے؟ دیویندر نے گوتم کو چائے پر گھر بُلایا۔

شیلا کے کان گوتم کی باتیں سنتے سنتے پک گئے تھے۔ شیلا نے اُسے دیکھا نہ تھا۔ شاید اس سے پہلے گوتم اس گھر میں کبھی آیا بھی نہ تھا۔ اس لیے بھابی تو سپنے میں بھی نہ دیکھی تھی۔ شیلا اُس سے یوں تپاک سے ملی، جیسے برسوں سے جانتی ہو۔ دیویندر نے شیلا کو چائے لانے کے لیے کہا اور پھر اُٹھ کر اس کے کان میں کھُسر پھُسر کرتے ہوئے اندر بھیج دیا۔

بس، یہی غلطی ہوئی۔ شیلا اندر گئی تو چائے بناتے ہوئے مُنّی سے کہہ دیا۔ ”مُنّی، اندر بیٹھک میں نہ جائیو۔“

”کیوں؟“ مُنّی نے پُوچھا ”وہ آ گئے، بھیّا کے۔۔۔؟“

”ہاں۔“

اور پھر شیلا خود کیتلی و تیلی نکالنے لگی۔

بھابی منع نہ کرتی تو شاید مُنّی کو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن اب۔۔۔ اس کے تن بدن میں کوئی آگ سی لپک آئی۔ وہ اب اس حالت کو پہنچ گئی تھی جس میں لڑکیاں

آنکھیں بند کر کے صرف آوازیں سُنا کرتی ہیں اور پھر بے دم ہو کر گر جاتی ہیں۔
مُنّی سوہی کے لیے شاید آواز کافی نہ تھی۔ بھابی کے اندر جاتے ہی وہ بر آمدے کی طرف لپکی اور سیڑھیوں پر سے ہوتی ہوئی نیم چھتے پر جا پہنچی۔ جہاں ایک روشن دان بیٹھک کے اندر کھلتا تھا۔۔۔

شیلا ٹرے میں چائے اور کچھ دال مُوٹ وغیرہ لیے بیٹھک میں آئی۔ دیویندر نے اُچھلتے ہوئے کہا۔۔۔ "ٹھہرو۔۔۔ میں کچھ پیڑے لے آؤں۔"

"ارے نہیں بھائی۔۔۔" گوتم نے روکا۔

"ایک منٹ میں آتا ہوں" دیویندر نے کہا "میں جانتا ہوں تم پیڑے بہت پسند کرتے ہو" اور اس سے پہلے کہ دیویندر کو کوئی روکے، وہ نکل گیا تھا۔

مُنّی روشن دان سے دیکھ رہی تھی۔ گوتم آگے بڑھ بڑھ کر بھابی شیلا سے دیور کا رشتہ جگا رہا تھا۔ دیور بھابی کا رشتہ جو ایک طرح سے ہر دیور کے لیے شادی کی ریہرسل ہوتا ہے۔۔۔ جس میں ادب کی حد سے پرے اور ننگے پن کی سیما سے

ورے کی باتیں ہوتی ہیں۔۔۔ بھابی چیز بھی ایسی ہوتی ہے کہ اس کی ہر نس، اس کا ہر پور چھڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ گوتم شیلا سے کہہ رہا تھا۔ ”کوئی زور لگاؤ، بھابی۔۔۔ ایک بیٹا جن دو۔ نہیں تو یہ بھیّا میرا، دوسری شادی کرے گا۔“

دیویندرا ابھی آئے نہیں تھے۔ بھابی نے دال موٹ والی پلیٹ سامنے رکھ کر چائے انڈیلی اور کہا۔۔۔ ”ہاں دیور جی۔۔۔ یہ کہہ بھی رہے تھے۔“

”کیا کہہ رہے تھے؟“

”یہی کہ اگلی بیساکھی تک کچھ نہ ہوا تو۔۔۔ دوسرا بیاہ کرلیں گے“ اور شیلا نے جان بُوجھ کر مُنہ پرے کرلیا۔ جیسے رونے لگی ہو۔۔۔

گوتم لپک کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ ”سچ بھابی۔۔۔؟“ اور اس کے ہاتھ اَن جانے ہی میں آستینیں چڑھانے لگے، جبھی اسے ایک کھِلّی سنائی دی۔۔۔ بھابی ہنس رہی تھی!

گوتم سمجھ گیا۔ ایک تسکین کی سانس لیتے ہوئے بولا ”اوہ بھابی۔۔۔ تو نے تو میری

جان ہی نکال لی" اور پھر چارپائی پر دھم سے بیٹھ گیا، جو صوفے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

بے وقوف تو گوتم بن ہی گیا تھا، لیکن اس ہزیمت سے بچنے کے لیے برابر ہاتھ پیر مارتا رہا۔ ظاہر ہے گھر آنے سے پہلے دونوں دوستوں میں کچھ تو راز و نیاز کی باتیں ہوئی ہوں گی۔ چائے کی پیالی تھامے ہوئے وہ شیلا کے قریب ہو گیا اور کان کے پاس مُنہ کرتے ہوئے بولا "مذاق کی بات نہیں بھابی! سُنا ہے دیویندر بھیّا نے ایک نرس رکھّی ہے۔۔۔"

شیلا کے من میں آگ کا بھبھکا سا اُٹھا۔ سارے بدن میں آگ لگ گئی۔ اب وہ نہ مذاق کر سکتی تھی اور نہ سن سکتی تھی۔ اس کے "اہم" کو جو ٹھیس لگی تھی۔ اس میں اس نے گوتم ہی کا تختہ کر دیا۔ ایک دم ناک پھُلاتے ہوئے بولی۔۔۔ "ٹھیک ہے۔۔۔ مرد ہے تو رکھتا ہے نا، اور کیا تم سا چُوہا عورت رکھے گا؟"

دیویندر پیڑے لے کر آیا تو گوتم رومال سے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھ رہا تھا!

مُنّی کی تلاش میں دادی رُقمن گھسٹتی ہوئی نیم چھتے پر آئی تو دیکھا۔۔۔ مُنّی بے ہوش پڑی ہے۔ دادی نے سر پیٹتے ہوئے آوازیں دیں۔ شیلا آئی، پھر گُلّو کی ماں اور سب مل کر ایک چمچے سے مُنّی کی دندن کھولی۔ ہاتھ اور پیر مل مل کر سیدھے کیے۔ بڑا اڈراما ہوتا، مگر گوتم جب تک رخصت ہو چکا تھا۔۔۔

کچّی پکّی جگہ، سایہ آسیب کی باتیں ہونے لگیں، لیکن بھیتر سے سب جانتی تھیں۔ یہ سب کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ مُنّی ہوش میں آئی تو شرمندہ تھی، اپنے آپ سے شرمندہ۔۔۔ ''نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے؟'' وہ بولی اور دادی کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شام تک مُنّی ٹھیک ہو چکی تھی اور گھر کا کام کاج کر رہی تھی۔۔۔ آج شیلا نے سبزی اور دال دونوں میں غلطی سے دو بار نمک ڈال دیا تھا۔ اب وہ اور مُنّی دونوں ڈر رہی تھیں۔ باپو آئے تو کیا ہو گا؟ وہ تو عام نمک سے بھی کم پسند کرتے ہیں۔ کہیں پرانے ج لال میں آئے تو تھالی کٹوری سب باہر پٹخ دیں گے۔

رات باپو آئے۔ ہمّت کر کے مُنّی نے کھانا پروسا اور باپو نے کھانا شروع کیا۔ شیلا اور مُنّی دونوں کی آنکھیں باپو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پہلا ہی گراس باپو جی کے مُنہ میں رُکا۔ پھر انہوں نے یوں اندر نگل لیا جیسے روٹی نہیں، حلوا کھا رہے ہوں۔ شیلا نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"آج نمک کچھ زیادہ ہی پڑ گیا ہے، باپو جی۔"

باپو جی نے ایسے کہا، جیسے انہیں کچھ پتہ ہی نہیں، بولے "ہیں۔۔۔؟ نہیں تو بیٹا۔ نمک تو ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔"

دو چار نوالے اور مُنہ میں ڈالتے ہوئے بولے۔ "دراصل آج مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔۔۔ مہاتما جی نے دُہرا پرساد دے دیا نا۔"

مُنّی نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور دوڑ کر جمنا کے ہاں سے تھوڑی دال لے آئی اور باپو کے سامنے رکھی۔ باپو جب تک تھالی پرے سرکا چکے تھے۔ شیلا اندر بستر ٹھیک کرنے کے لیے چلی گئی تھی۔ مُنّی نے کٹوری تھالی میں رکھ کر اسے قریب

کرتے ہوئے کہا۔۔۔ ”کھانا پڑے گا، باپو جی۔“

باپو جی کو بھُوک تو لگی تھی۔ چپکے سے نوالہ توڑ کر دال میں بھگوتے اور مُنہ میں رکھتے ہوئے اندر کی طرف دیکھا اور بولے۔۔۔ ”بہُو دیکھے گی تو۔۔۔“ اور پھر اندر سونے والے کمرے کی طرف جہاں بہُو گئی تھی، دیکھتے ہوئے کھاتے رہے۔۔۔ دوسرے دن گوتم کو آنا تھا۔۔۔ لڑکی دیکھنے!

مُنّی کو تو کوئی اُمید نہ تھی۔ بھابی نے جو اس کی دُردشا کی تھی، اس کے بعد تو کوئی بھی مرد اس گھر میں نہ گھستا۔ پر اُس بات کا نتیجہ اُلٹا نکلا۔ بھابی کے شبدوں نے گوتم میں کا مرد اور بھی تندی سے جگا دیا۔

بیٹھک میں آج باپو تھے، دیویندر بھی اور دادی بھی۔ مُنّی کو سادہ مگر خوبصورت کپڑے پہنا کر ایک طرف بٹھا رکھا تھا اور اسے کڑی ہدایت تھی کہ اُٹھے نہیں، ورنہ سب معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔

گوتم آیا۔ اس کی پگڑی کو بہت کلف لگا تھا۔ شملہ سر پر ایک فُٹ اُوپر اٹھا ہوا تھا۔

اور اپنے ناٹے قد کے باوجود لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ آتے ہی اس نے مُنّی کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا۔ مُنّی کی محجوب نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

ایکا ایکی گوتم کچھ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے مُنّی کی طرف دیکھا اور دیویندر سے بولا۔ ''بھیّا! تم بھی پانی پیؤ گے؟''

''ارے ارے! پانی کیوں؟'' دیویندر نے کہا ''کوئی شربت لاؤ شیلا''

شیلا کی بجائے خود حکم لینے کی عادی مُنّی ایکا ایکی اُٹھی۔ دادی نے دھپ سے ایک ہاتھ مُنّی کے سر پر مارا۔ ''بیٹھی رہ۔۔۔ تو کہاں جا رہی ہے؟''

اور مُنّی جو آدھی ہی اُٹھی تھی۔ بیٹھ گئی۔ لیکن آدھی ہی میں وہ ساری معلوم ہو رہی تھی۔۔۔ اسے کچھ یاد آیا، کچھ بھول گیا۔۔۔

اس شام محلّے بھر کے منھ میٹھے ہونے لگے۔ بدھائیاں ملنے لگیں۔۔۔ گوتم نے مُنّی سوہی کو پسند کر لیا تھا۔۔۔!

سب کو یقین ہو گیا تھا کہ مُنّی سوہی جا رہی ہے۔ ایک نہیں یقین آ رہا تھا تو دادی رُقمن کو۔۔۔ میں تو اس دن مانوں گی، جس دن بچّی یہ ڈپٹی بھون کی دہلیز چھوڑے گی۔ اور ڈولی میں بیٹھتے ہوئے پوری ایک پائیلی چاولوں کی اپنے سر کے اوپر سے پھینکے گی۔۔۔ اور پھر جیسے شادی میں ہونے اور نہ ہونے والی باتیں دادی رُقمن اپنے سامنے دیکھ رہی تھی۔ "دیکھ بہُو، گو تم کا باپ ڈولی پر سے کھوٹے پیسے بھی پھینکنے تو انہیں مُہریں سمجھنا" پھر اس بات کا ڈر کہ جس بات سے ڈرو، آخر وہی ہوتی ہے۔۔۔۔

دادی نے دیول میں مورتی کے لیے وستروں کی منت تو مانی ہی تھی، بڈھن شاہ کی درگاہ پر حلوے کی دیگ بھی مان آئی۔ ساتھ وہ شاہد کی ماں کو بھی لے گئی تھی، جیسے رشوت کے طور طریقوں کو اچھی طرح سے نہ جاننے والا کسی بچو لیے، کسی واقف کار کو ساتھ لے لیتا ہے، تاکہ قانون کہیں اُلٹا ہی نہ پڑے۔۔۔

اب بیاہ کے سلسلے میں چاروں طرف سے مُنّی کو ہدایتیں ہونے لگیں۔ جو جانتی تھیں وہ بھی اور جو الھڑ تھیں وہ بھی، اپنے اپنے طریقے سے مرد کو مطیع کرنے کے

طریقے بتانے لگیں اور پھر دادی۔۔۔ جس کے مرد کو گئے ہوئے پچاس سال سے اُوپر ہونے کو آئے تھے اور جس کے بچاروں میں مرد، اس کی آنکھوں کی طرح دھندلا سا ہو کر رہ گیا تھا، بولی۔ "دیکھ بٹیا!۔۔۔ میں تیرے نِکٹ ہوں گی بھی اور نہیں بھی۔ہاں، جہاں سہاگن کھڑی ہو سکتی ہے، وہاں بدھوا تو نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ یہی ہے ساری دنیا کی ریت۔ یہی شاستر پان بھی کہتے ہیں۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔۔۔ پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی۔ آنکھیں پونچھتی ہوئی شروع کرتی۔ "اور سُن۔ جب پھیرے ہوں گے نا۔ تو جھک کے چلنا۔ بہت جھک کے بیرن! نہیں کیا کرایا سب دھرا رہ جائے گا۔۔۔ دیکھ، یوں۔۔۔ اور پھر دادی رُقمن سر پر اپنے بیٹے جگن کی بندھی بندھائی پگڑی رکھ لیتی اور ہاتھ میں کرپان کی جگہ کپڑے دھونے والی تھپکی اور دولہا بنی ہوئی اپنی طرف سے اکڑ اکڑ کر چلتی۔ عورتیں ہنستیں، لڑکیاں لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی ایک دوسرے کے دو ہتّڑ مارنے لگتیں۔ مُنّی شرماتی، روتی، پر دادی اسے برابر پیچھے جھک کر آنے کے لیے کہتی۔

گُلّو کی ماں پکار اُٹھتی۔ "چھ پھیرے لینا امّاں۔۔۔ ساتواں مت لینا۔۔۔"گُلّو کی ماں

کا مطلب تھا، سات پھیرے ہوئے تو مُنّی کی دادی کے ساتھ شادی ہو جائے گی۔
ایسی شادی جسے وید شاستر تو کیا سوئم بھگوان بھی نہیں توڑ سکتے۔

جب مُنّی پیچھے آتی ہوئی تھوڑا کم جھکتی، دادی مُڑ کر دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پر مارتی۔ "نیچی اور نیچی۔۔۔" مُنی درد سے بلبلاتی ہوئی روتی بھی اور ہنستی بھی۔ "بھاڑ میں جائے ایسا دولہا" وہ دادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی "جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا" دادی اُسے پھٹکارتی۔ "نصیبوں جلی، عورت نہ جھکے تو اس دُنیا کا چکر نہیں چلتا۔۔۔ نِویں سو گوراہوئے۔۔۔ جو نیچا ہوتا ہے، آخر وہی اُونچا ہوتا ہے اور پھر تُو؟ تجھے تو اور بھی نیچی ہو کر چلنا چاہیے، جسے سوئم بھگوان نے اونچی بنایا۔۔۔ مرد کا سواگت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جاچک ہوتا ہے نا، ہمیشہ کوئی دان مانگتا ہے، جو دینا ہی اُچت ہے۔ کبھی دیوی بھی پجاری پر اپنے کواڑ بند کرتی ہے؟"

یہ دادی کو بھی نہ معلوم تھا کہ دیکھنے میں یہ سرکش لڑکی وقت آنے پر جھک کے چلنا تو ایک طرف، رینگنے، لیٹ جانے کو بھی تیار ہو گی۔

شیام گلی میں ایکا ایکی بیسیوں ہی لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ وہ آج تھوڑی پیدا ہوئی تھیں؟ تھیں وہ یہیں۔۔۔ برسوں، صدیوں سے۔ بس بیاہ کا شبد اُچارن کرنے کی دیر تھی کہ وہ جیسے کسی جادو، کسی جنتر کے زور سے بے اختیار، بے بس، ایک دوسری پر گرتی پڑتی ہوئی کہیں سے آ گئیں۔ جیسے آموں کے موسم میں بڑی بڑی، ہری نیلی مکھّیاں کہیں سے اپنے آپ چلی آتی ہیں اور جب تک کوئی آم چُوستا ہے، وہ اِرد گرد منڈلاتی بھنبھناتی رہتی ہیں۔۔۔ آتے ہی وہ کوئی ڈھولک ہاتھ میں لے لیتی ہیں اور ایسے ایسے نورانی گانے گاتی ہیں جو دادی کی آنکھوں کی طرح کی دھندلی صدیوں سے، ان کے گلے میں اٹکے ہوتے ہیں۔۔۔ پھر ایک جیجا رار کرنے کو ملتا ہے۔۔۔ جیسے ہر عورت کو بدن سہلوانے، دبوانے سے ایک عجیب طرح کا سُکھ ملتا ہے۔ ایک خاص قسم کا حظ آتا ہے۔ ایسے ہی ان لڑکیوں کو بھی، جب کوئی جیجا یا برات میں آیا ہوا کوئی منچلا ان کے چٹکی کاٹ لیتا ہے اور یا کمر میں اس جگہ چھُو لیتا ہے، جہاں بجلی کے سینکڑوں، ہزاروں کلو واٹ جمع ہوتے ہیں۔۔۔ باہر تو کوئی ڈر کے مارے ان کی طرف اُنگلی اُٹھانے کی ہمت کرتا ہے اور

نہ یہ اٹھانے دیتی ہیں، لیکن شادی بیاہ میں ان باتوں کی کھُلی چھُٹی ہوتی ہے۔ بڑے چھوٹے سب دیکھتے ہیں اور مُسکرا کر چُپ ہو جاتے ہیں۔۔۔ جیجا کو بھی تو سالیاں ملتی ہیں۔ ایک ایک سالی، آدھی گھر والی۔ اتنی لڑکیوں کا جھُرمٹ چھیڑنے، پیار کرنے کو پھر زندگی میں کہاں ملتا ہے؟ اور یہ سالیاں، اپنے رُوپ کی کوئی جھلک دکھا کر، قدم قدم پر کوئی انگیخت پیدا کرتی ہوئی کہیں چھپن، کوئی الوپ ہو جاتی ہیں، جیسے یوگیشوروں اور تپیشوروں کے من کی مینکائیں، اللہ والوں کی حُوریں، جو انہی کے داخلی تخیل کی پیداوار ہوتی ہیں، جس کے کارن ان آسمانی عورتوں کے بدن پر ایک بھی تو خط غلط نہیں لگا ہوتا۔ اگر یوگی پتلی عورت کو پسند کرتا ہے، تو وہ پتلی ہوتی ہے۔ بھری پُری کا گرویدہ ہے تو وہ بھری پُری اور یوگیشور انہی کے ساتھ آلنگن، انہی کے ساتھ پریم کھیلن کے لیے مچل جاتا ہے اور آگے بڑھنے، اوپر جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ یوگیشور کو پکارتے پکارتے شبد رُوپی گورو کا گلا بیٹھ جاتا ہے، اور جیوتی سُروپ ایشور کی آنکھوں سے جوت جاتی رہتی ہے۔۔۔ اور یہ اپسرائیں، یہ حُوریں یوگیوں اور صوفیوں کو اپنے اپنے رُتبے،

اپنے اپنے مقام سے گرا کر اس خلوتِ صحیح سے ہمیشہ کے لیے غلط ہو جاتی ہیں۔۔۔

مگر یہ دُنیا کتنی پیاری جگہ ہے۔ جہاں کے لوگ خدا نے بنائے اور پھر فرشتوں سے کہا ان کو سجدہ کرو۔۔۔ سالیوں کے چلے جانے کے بعد آخر ایک دن، ایک رات عظیم "وہ" سامنے بیٹھی ہوتی ہے، ویدوں کے منتر اور شاستروں کے ارتھ جس کی طرف کبھی واضح اور کبھی مبہم سے اشارے کرتے ہیں۔ بیاہ شادی کے گیت جس کے لیے مرتعش اور بھٹّوں میں جس کے لیے اینٹیں پکتی ہیں۔ مِل میں کام کرنے والا مزدور، جس کے لیے پان بیڑی کی دکان پر پہنچ کر اپنی جیب کی آخری دونّی سے آنکڑ لگاتا ہے اور سبھاؤں میں شور جس کے لیے بڑھتا ہی جاتا ہے، جسے اُس کے بچوں کی ماں ہونا ہے۔۔۔ اِس لیے وہ اس دھرتی کی طرح ڈرتی، سمٹتی ہے جس میں کسان آتا ہے۔۔۔ ہل کاندھے پر ڈالے، جس کا تیز اور تیکھا پھل ابھی ابھی کسی لوہار نے تیز آنچ والی بھٹّی میں ڈھالا ہے۔۔۔ سر پر پگڑی باندھے، کلغی سجائے وہ راجا جنک معلوم ہونے لگتا ہے، جو دھرتی کو الٹائے گا تو نہ جانے

کب سے اس میں دبی ہوئی کوئی مٹکی پھوٹ جائے گی اور اس میں سے بڑے ہی صبر، بڑے ہی ایثار، بڑے ہی پیار والی، جنک دُلاری سیتا پیدا ہو گی۔۔۔ جس کے لیے اس کا عظیم "وہ" آتا ہے۔ ایک ہاتھ میں مقدّس کتاب، دوسرے ہاتھ میں شراب لیے۔۔۔ تاریخ کے دُھندلے ادوار میں وہ اَن گنت گوپیوں سے کھیلا ہے۔ ان کے ساتھ بے شمار راسیں رچائی ہیں۔ اور اب اس کی آنکھوں میں ڈر ہے اور محبت اور بہیمیت۔ وہ سمجھتا ہے اس بار کی تر و تازہ، حسین و جمیل دوشیزہ کے بدن پر قبضہ جمائے گا، بار بار اپنائے گا، بے ہوش ہو ہو جائے گا۔ اور نہیں جانتا وہ محض ایک تنکا ہے، زندگی کے بحرِ ذخّار میں۔ صرف ایک بہانہ ہے، تخلیق کے اس لامتناہی عمل کو ایک بار چھیڑ دینے، ایک بار حرکت میں لے آنے کا اور پھر بھول جانے کا۔۔۔ دنیا بھر کے گوداموں میں بھرا ہوا اناج کسی وقت ایک دانۂ محض تھا، جو شاید اب اس دانے کو بھی معلوم نہیں کیونکہ موت اسے لوٹ چکی ہے۔ زندگی ایک بار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہے۔۔۔ کاش انسان کو یہ معلوم ہو جائے تو وہ ایک بھُوکے کی طرح عورت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔

پھر عورت بھی خواہ مخواہ اپنی عصمت نہ بچائے، اس پر سونے چاندی کے ورق نہ لگائے۔۔۔

شادی کے کچھ ہی دن رہ گئے تو پتہ چلا، گوتم نے سائیکلوں کی ایجنسی چھوڑ دی ہے۔ اور آسام میں دیما پور سے پچاس ساٹھ میل دُور، کسی جنگل میں کوئی ٹھیکہ لے لیا ہے، جہاں مہینے ایک کے بعد کہیں چٹھی پہنچتی تھی، جیسے ہوائی ڈاک، ریل گاڑی سے نہیں، پیدل چل کر جاتی ہو۔۔۔ شادی ایک غیر معین عرصہ کے لیے ملتوی ہو گئی۔

دادی کی تو جان ہی نکل گئی۔ اسے پسینے آنے لگے۔۔۔ ٹھنڈے پسینے، جن کا باہر کی سردی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے پہلے جب بھی گوتم کی چٹھی آتی، دادی رُقمن نے مُنّی سوہی کو بلایا اور اس کا سر چُوم لیا۔ بُلایا اب کے بھی لیکن چومنے کی بجائے زور کا ایک دو ہتّڑ اس کے سر پہ جڑ دیا۔۔۔ یہ لڑکی ہی منحوس تھی، کسی منحوس گھڑی میں پیدا ہوئی، کوئی منحوس ماں باپ کے گھر جنم لیا۔ اور اب جہاں بھی جائے گی، تباہی اور بربادی لائے گی۔۔۔ دینا پور اور دیما پور تو کیا پُورے بہار،

پورے بنگال، آسام، دیس میں کھلبلی مچ جائے گی۔۔۔ پھر گیتا کے پنّے کھلے، پھر سترھویں ادھیائے کا پاٹھ ہوا، پھر دادی مری، پھر جی اُٹھی، کیونکہ پاٹھ کی سماپتی کے ساتھ ہی گوتم کی چٹھی چلی آئی تھی جس میں لکھا تھا اگلے سال مُنّی کی بیس تاریخ کا ساہا نکلا ہے۔۔۔ دادی سمجھ بیٹھی تھی، گوتم نے کہیں مُنّی کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور سوچ لیا ہے۔ لیکن اسے کیا معلوم مُنّی، بیٹھی ہوئی مُنّی کی کثافت نے گوتم کے پورے ذہن کا کچھ یوں احاطہ کر رکھا تھا کہ وہاں اب کسی اور لطیف سی سوچ اور سمجھ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ الٹو اتو ایک مجبوری تھا!

دادی ایک بار پھر مہینے اور دن گننے لگی، جیسے بیوہ چھت کی کڑیاں اور رنڈوا آسمان کے تارے گنتا ہے۔ پھر ایکا ایکی انسان تو کیا وہ بھگوان، آگ، پانی، ہوا سب کو گالیاں دینے لگتی۔ اس میں صبر تو حد درجے کا تھا لیکن شُکر نام کو نہیں۔۔۔ جب تک مُنّی پانچ فٹ سوا دس انچ کی ہو چکی تھی۔ اس کی کہانی اس قصّے کی طرح ہو گئی تھی جس میں قصّہ کہنے والا اپنا سر بچانے کے لیے بادشاہ کو ایسی کہانی سناتا ہے جو ختم نہیں ہو سکتی۔۔۔ سُوراخ میں سے چڑیا آئی اور دانہ لے گئی۔ چڑیا پھر آئی اور

ایک دانہ اور لے گئی۔۔۔ اور کوٹھڑی دانوں سے بھر پڑی تھی، آسمان ستاروں سے پٹا ہوا تھا۔ شاہد میاں کے گھر کے پاس کچنار میں ہزاروں لاکھوں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔۔۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیاہ اور صرف بیاہ ہی اس طُولانی عمل کو روک سکتا ہے۔ ورنہ کوئی ہی دن میں مُنّی کا سر آکاش میں ہو گا اور وہ اُوپر کی اُوپر چلی جائے گی، جیسے کنس کے نیچے ٹخنے سے مہامایا بجلی بن کر آسمان کی طرف لپک گئی تھی۔۔۔

''جب تک تو گوتُو بھی لمبا ہو چکا ہو گا'' دادی کہتی۔

''کیا پتہ، میّا؟'' جمنا کہتی۔ پھر ڈگامبروں کی بہُو ترمبکا بائی ایک قدم آگے بڑھ کر بول اُٹھتی ''ہو سکتا ہے انچ دو انچ چھوٹا بھی ہو گیا ہو'' اور پھر وہ ایک دوسرے کو ٹہوکے دیتے ہوئے مسکرانے لگتیں۔

''ارے!'' دادی ترمبکا بائی کو پھٹکارتی ''میں اتنا بھی نہیں سمجھتی، پلُوتی! ایک بار جو بڑھ جائے، پھر نہیں گھٹتا'' اور پھر۔۔۔ ''میں بوڑھی جرور ہو گئی ہوں، ترمبکا! پر

عقل میں تجھ پہ بیس ہوں، بیس۔"

پھر گُلّو کی ماں حساب کر کے بتاتی۔ "اگر لڑکے کا قد اتنا ہی رہے، دادی! اور لڑکی کا چار پانچ گرہ، دو تین انگل بڑھ جائے، تو وہ آپی چھوٹا ہو گیا کہ نہیں ہو گیا؟"

اتنا حساب دادی کو کہاں آتا تھا؟ مُنّی سوہی کے دو تین انگل اور لمبی ہو جانے کے خیال ہی سے خون اس کے خشک چہرے کی رگوں اور ریشوں میں دوڑنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے پیپل سے گرا ہوا پتّہ پھر اپنے ڈال پہ جا لگا ہے اور دوسرے پتّوں سے ٹکرا رہا ہے، شور مچا رہا ہے۔ وہ ترمبکا کو یا گُلّو کی ماں کو گالیاں دینے لگتی۔۔۔ "چھوٹا ہو تیرا باپ، چھوٹا ہو تیرا بھائی، چھوٹا ہو تیرا خصم۔۔۔" اور عورتیں یہ سمجھتی ہوئی کہ دیوی دلوی کی گالیوں سے گرہ ٹلے، ہنسی کھیلتی اپنے گھر چلی جاتیں، جہاں انہیں اپنے مرد، کیا باپ اور کیا بھائی اور کیا شوہر ایکا ایکی چھوٹے معلوم ہوتے لگتے!

مُنّی سوہی اب تک اپنی ہر نس، اپنے ہر پور سے نفرت کرنے لگی تھی۔ وہ شادی

بیاہ کے نام ہی سے خائف ہونے لگی۔ کیا شادی بیاہ ہی رہ گیا ہے، اس دُنیا میں؟ اس کے سِوا اور کوئی راستہ نہیں؟ کہیں بھی جانا ہو، وہاں پہنچنے کے لیے بیسیوں سڑکیں، سینکڑوں پگڈنڈیاں ہوتی ہیں۔ بیاہ کے لیے کیا ایک ہی جرنیلی سڑک ہے؟ آخر تھک ہار کر مُنّی لیٹ جاتی۔ سو جاتی جہاں اسے خواب میں دولہے ہی دولہے دکھائی دیتے۔۔۔۔

ایک دن دیویندر انگریزی تصویر "مولاں روش" دیکھ آیا جس میں اداکار، جوزے فیرار اپنے پیر پیچھے باندھ کر فرانس کا بونا مصوّر لوترک بنتا ہے۔ پہلے تو دیویندر نے نونو کروڑ گالیاں اپنے دیش بھارت کو دیں جس میں اتنا زور لگانے پر بھی صنعتی ترقی نہیں ہوتی، جہاں سائیکل کے کچھ پُرزے ابھی تک ولایت سے آتے ہیں۔ جہاں میک اَپ کا آرٹ اتنا بھی نہیں پنپ سکا جس سے لمبے قد کا ایک آدمی ٹھگنا اور بونا لگ سکے اور اس بات کو وہ بھول ہی گیا کہ وہ پہلے ہی ٹھگنا ہے، اس سے اور ٹھگنا نہیں ہو سکتا۔

اس پر بھی دیویندر نے جوزے فیرار کی طرح اپنے پیر پیچھے کی طرف باندھے اور

گھٹنوں کے بل چل چل کر مُنّی کو دکھانے لگا۔۔۔ ”ایسے ہی پیر باندھ لینا، مُنّی! تب گوتم کے ساتھ ٹھیک سے پھیرے لے سکے گی۔۔۔“

”اگر رسّی کھُل گئی تو“ مُنّی کی سہیلی گوراں پُوچھتی۔

”تو چُپ کرنا“ دیویندر اسے ڈانٹ دیتا ”مُنّی کا تو پھر بھی بیاہ ہو جائے گا، ڈھائی فُٹّی!۔۔۔ تیرا کبھی ہو گا ہی نہیں۔“

اور چھوٹے قد کی گوراں دیویندر کو دانت دکھاتے ہوئے ”ای ای ای“ کرتی اور پھر ایک طرف چھُپ کر رونے لگتی اور پھر آپ ہی اپنے آپ کو منا کر مُنّی کے پاس آجاتی اور کہتی۔۔۔ ”مُنّا! کہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو اپنا کچھ قد مجھے دے دے اور میرا کچھ آپ لے لے۔۔۔۔“

”ایسا ہو جائے تو پھر۔۔۔۔ دُنیا ہی نہ بس جائے“ مُنّی جواب دیتی۔

اور پھر دونوں مل کر اس اُجڑی ہوئی دنیا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگتیں۔
جہاں ابھی تک دیویندر اپنی ہیکڑ میں گھٹنوں کے بل چل چل کر مُنّی کو دکھا رہا تھا

اور کہہ رہا تھا۔۔۔ ”ایسے ایسے۔۔۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا! اپنے الٹے طریقے سے وہ اس لمبی لڑکی کو وہی بات سمجھا رہا تھا، جو آج سے صدیوں پہلے ارسطو نے عورت کے نیچے گھوڑا بنتے ہوئے سکندر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن پوری طرح سے سمجھا نہ پایا تھا۔۔۔ اس ادھورے کام کو دیویندر پورا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اسے اذیت ہو رہی تھی لیکن کرب کا کوئی بھی اثر وہ اپنے چہرے پر نہ آنے دیتا۔ خاصی دیر تک وہ چلتا رہا۔ حتّٰی کہ اس کے گھٹنے چھل گئے۔۔۔ ترمبکا اور جمنا اس کی طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں اور پُکار رہی تھیں۔۔۔ ”شیلا۔۔۔ اری او شیلا۔۔۔“

آخر ایک دن برات آ ہی گئی، پھیرے بھی ہو ہی گئے۔

پھیروں میں مُنّی دُہری، تہری ہو کر چل رہی تھی۔ لیکن اب اس بات کا کیا علاج کہ اتنے نیچے ہوتے ہوئے بھی وہ گوتم سے لمبی لگ رہی تھی؟ ترمبکا کا خیال صحیح تھا۔ گوتم کا قد اور بھی چھوٹا ہو گیا تھا اور یا۔۔۔ ”نیچی، اور نیچی۔۔۔“ مُنّی نے دھرتی میں گھُس جانے کی کوشش کی، لیکن دھرتی نے ساتھ نہ دیا۔ وہ آسمان کی

طرف لپک سکتی تھی، دھرتی میں نہ سما سکتی۔

آشیر واد کی جگہ کئی بار دادی کے گُپ چُپ دھپّے مُنّی کے سر پر پڑے، جس سے اس کا سر بول اُٹھا۔ وہ تو اسے اپنی آخری مصیبت سمجھتی تھی، لیکن دادی کا خیال ایسا نہ تھا۔ جو جھُوٹ اس نے اور اس کے بیٹے، پوتے اور تیلی محلّے کے سب مرد عورتوں نے مل کر بولا تھا، آخر تو اُسے کھُلنا تھا۔ دادی چاہتی تھی کھُلے تو کھُلے پر ابھی نہ کھُلے۔۔۔ ایک بار شادی ہو جائے، پھر اسے انسان تو کیا بھگوان بھی نہ توڑ سکیں گے۔ لیکن۔۔۔ آخر وہ پھر مُنّی کو اُونچا ہو کر چلتی ہوئی دیکھتی، تو اپنے کلیجے میں مُکّا مارتے ہوئے کہتی۔۔۔۔ "ہائے رانڈ، تو نہ بسے گی۔"

پنڈت لوگ منتر پڑھتے رہے، جن کا مطلب تھا۔۔۔ تم جانوروں کی طرح سے نہیں رہو گے۔۔۔ بے موسم کا بھوگ بلاس نہیں کرو گے۔۔۔ تم بیمار اور فاتر العقل بچّے اس دُنیا میں نہیں لاؤ گے۔۔۔ اور اِرد گرد کے لوگ بیمار اور فاتر العقل بچوں ہی کی طرح سے بیاہ کی رسم کو دیکھ رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ اشلوکوں کی زبان، سنسکرت سے واقف نہ تھے۔

بیاہ ہو جانے کے بعد جب بھی گوتم اندر، ڈپٹی بھون کی بیٹھک میں آیا، اس نے مُنّی کو بیٹھے ہوئے پایا۔ مُنّی کو اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کی سخت مناہی تھی جس سے اس کے بدن کی ہڈیاں تک اکڑ گئیں۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے سے اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوئی، ابھی تک ماں کی کوکھ میں پڑی ہے اور باہر آنے، ہاتھ پیر پھیلانے کے لیے تڑپ رہی ہے۔۔۔

سُوکھم مُنّی نے گوتم کو اپنا داماد اور مُنّی کو اپنی بیٹی جانتے ہوئے اپنے گھر کھانے پر بُلایا، لیکن دیویندر نے اسے سمجھا بُجھا کر لوٹا دیا۔ شام کے قریب گوتم نے سینما دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ جانا، کوئی موج اُڑانا چاہتا تھا۔ لیکن دادی نے انکار کر دیا۔ وہ خود تو کچھ نہ بولی لیکن اپنے بیٹے جگن ناتھ کو اشارہ کر دیا، جس نے بڑے پیار کے ساتھ گوتم سے کہا۔۔۔ ”یہاں نہیں بیٹا۔۔۔ ہم تیاگی ذرا پُرانے خیال کے لوگ ہیں۔ تو اسے گھر لے جانا، پھر جو جی چاہے کرنا۔“

اور گوتم خاموش ہو گیا۔

اگلی سویر کو گوتم کا باپ، گوتم اور برات میں آئے ہوئے سب آدمی دیما پور جانے کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ پہلے کلکتہ جانا تھا۔ اس میں رِیت تھی کیونکہ بھائی ہونے کے ناطے دیویندر ہی کو مُنّی کو ڈولی میں ڈالنا تھا۔۔۔ کسی کتاب میں لکھا ہے کہ مرد کو شادی اس وقت کرنی چاہیے، جب وہ عورت کو اپنی پٹھّوں کے زور سے ایک ہی ہاتھ سے اٹھا سکتا ہو۔ دیویندر شادی شدہ آدمی تھا، لیکن اس سے کنواری بہن کو اٹھایا نہ گیا۔ مُنّی یوں اس سے لپٹی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی کہ اس کے اُٹھائے ہونے کا گمان ہو۔ حالانکہ وہ بیچ بیچ میں چلتی جا رہی تھی۔ مُنّی نے ایک ہی مٹھی چاولوں کی سر کے اُوپر سے پھینکی۔ لیکن دادی جو تھی۔۔۔ جس نے پوری بوری خالی کر دی۔ پھر ڈولی اُٹھی، سسر نے ڈولی کے اُوپر سے نئے پیسوں کی چھوٹ کی۔ چونکہ وہ خود جا کر بینک سے دس روپے کے نئے نئے پیسے لایا تھا، اس لیے وہ ڈولی پر سے گرتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے اور سچ مچ کی چھوٹی چھوٹی مُہریں معلوم ہو رہے تھے۔۔۔ گلی بازار کے بچے پیسے اُٹھانے، ڈولی کی راہ روکنے لگے۔۔۔ دادی رو رہی تھی اور بچوں سے کہہ رہی تھی۔۔۔ "لُچّو،

شہدو۔۔۔ جانے دو، ارے ڈولی کو تو جانے دو‘‘ جیسے ڈولی اب بھی واپس آسکتی تھی۔

دادی کے اشارے پر دیویندر بچوں کو مار مار کر راستے سے ہٹانے لگا۔ ایک چھوٹ اور ہُوئی اور لرزتے ہوئے پیسے سامنے زمین پر گرے۔ دیویندر کے من کا بچّہ اُبھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی لپکے اور چمکتے دمکتے ہوئے پیسے اُٹھالے اور ان پیسوں کو لگی ہوئی مٹی اور دُھول سے صاف کر کے جیب میں ڈال لے۔ لیکن۔۔۔ اندر ہی اندر وہ مُسکرا دیا!

شیلا حسبِ معمول جھوٹ موٹ کے آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں سے سچّے تو گوراں، گُلّو کی ماں، جمنا اور ترمبکا کے آنسو تھے، جو اپنے اپنے من میں چھوڑے ہوئے یا چھوڑے جانے والے بھائیوں اور باپوں کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔ پھر بہنوں کو، بھابیوں کو، جیسے سُسرال کے سب رشتے جھُوٹے ہوں۔ کیا نندیں اور کیا ساسیں اور کیا سسرے۔۔۔ شادی کے وقت وہ سب کیسے لپک لپک کر ذہن میں آرہے تھے۔۔۔

شیلا کو اندر ایک بہت ہی تسکین، ایک بہت بڑی چھُٹی کا احساس ہوا۔ جبھی اس کی نظر دادی پر پڑی جو تھڑے پر کھڑی، اپنی دُھندلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈولی کو دُور ہی دُور، نگاہوں سے دُور، دل سے دُور بھیجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دادی کو دیکھتے ہی اس کے ماتھے پر تیور آ گئے، اور اس نے کہا۔۔۔ ”یہ دوسری ڈولی نہ جانے کب اُٹھے گی۔۔۔؟“

دیویندر نے دادی کی طرف دیکھا۔ نہ جانے اس کے مَن میں کیا آئی کہ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گیا اور بولا۔۔۔ ”ماں!“ اور پھر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر، بلک بلک کر رونے لگا۔ دادی نے اسے چھاتی میں چھپا لیا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ دیویندر نے دادی کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا اور کسی ڈولی کی طرف لے کر چل نکلا۔۔۔

مُنّی کیا گئی کہ شیام گلی اور تیلی محلّے کی رونق بھی ساتھ ہی لیتی گئی۔ ہر چھوٹا بڑا پُوچھتا تھا۔۔۔ مُنّی کی کوئی چِٹھی آئی ہے یا نہیں، اور ہمیشہ جواب ملتا۔۔۔ آئی تو نہیں، پر آ جائے گی۔ مہینے دو مہینے کے بعد تو وہاں چِٹھی پہنچتی ہے۔

لیکن دادی رُقمن بھیتر سے ڈری ہوئی تھی۔۔۔ وہاں ضرور جھگڑے ہو گئے ہوں گے۔ ضرور انہوں نے میری مُنّی کو گھر سے نکال دیا ہو گا اور وہ کہیں جنگلوں میں خاک چھانتی پھر رہی ہو گی۔ ان جنگلوں میں جہاں سانپ سانپ جتنی بڑی جونکیں ہوتی ہیں۔ پیروں سے چمٹ جاتی ہیں اور ہولے ہولے یوں خون چوستی ہیں کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ وہ یوں ہی جیسے تھک کر آرام کرنے کے لیے بیٹھتا ہے تو پھر نہیں اُٹھتا۔۔۔

ضرور مُنّی کو کوئی شیر چیتا کھا گیا ہو گا۔ ورنہ مہینوں سے چٹھی نہ لکھنے کا کیا مطلب؟ اور پھر بیچ میں ایک آدھ چٹھی آ ہی جاتی، جسے دادی پہلے دیویندر سے پڑھواتی۔ پھر شاہد میاں اور پھر سُوکھم ڈگامبر سے۔۔۔ تب کہیں جا کے اس کی تسلّی ہوتی۔ تسلی کہاں؟ اگر مُنّی لمبا خط لکھتی تو دادی کو یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی رونے رو رہی ہے، الفاظ جن کا ساتھ نہیں دیتے۔ اگر چھوٹی لکھتی تو کہتی۔۔۔ دیکھا نا! میں تو پہلے ہی کہتی تھی، اسے کوئی منھ نہیں لگائے گا۔ کوئی ایسی بات ہے جو مُنّی چھُپا رہی ہے ورنہ مجھے ایسے دو اکھّر لکھ کے بھیج دیتی۔۔۔؟ یہی ہے نا، اپنے دیش کی

بیٹیوں کا۔ مرتی مر جاتی ہیں، پر شکایت کا لفظ بھی منھ پہ نہیں لاتیں۔۔۔ہے رام! اب کیا ہو گا؟ کہیں میں اُڑ کر دیما پور چلی جاؤں۔ ایک بار میں اپنی سوہی کو ہنستے، بستے ہوئے دیکھ لوں۔ تم سب جھوٹ کہتے جو۔ ضرور وہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ پر میری بیٹی کو جس نے تنگ کیا، بھگوان اس کا بھی بھلا نہیں کرے گا۔۔۔ میں مرنا چاہتی تھی۔ ہاں، اب اس دُنیا میں رہ ہی کیا گیا ہے؟ لیکن یہ مجھے مرنے، آرام سے جانے بھی نہیں دیتی۔ ہے بھگوان! انسان دنیا میں جس کو سجّن سمجھتا ہے، وہ کتنا بڑا دشمن ہوتا ہے۔۔۔

اور پھر۔۔۔ یہ ہو کیسے سکتا ہے، چھ فٹ کی لڑکی سے کوئی پانچ فٹ کا لڑکا بیاہ کر لے؟ اور پھر اسے بسا بھی لے؟ اب تک تو گوتو کو پتہ بھی چل گیا ہو گا اور دادی یوں بات کرتی، جیسے شاید نہ بھی پتہ چلا ہو۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور من ہی من میں کئی پرارتھنائیں کرتی۔ ہے بھگوان! کیا یہ نہیں ہو سکتا، جب گوتو مُنّی کی طرف دیکھے تو وہ اُسے چھوٹی لگے؟

ایک دن جگن ناتھ گھر میں آیا تو کچھ دیر سے۔۔۔ شاید دیر تک شاستر ارتھ

ہوتے رہے۔ گھر پہنچنے پر شیلا سو رہی تھی۔ جگن ناتھ چپکے دبکے رسوئی میں گیا تاکہ بہو کو جگانا نہ پڑے۔ انہوں نے اُوپر نیچے ہاتھ مارے، سر بھی چھینکے سے ٹکرا کر لہولہان کیا، لیکن کہیں کھانا ہوتا تو ملتا۔ اس بات کا علم نہ دادی کو ہوا اور نہ دیویندر کو۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ شیلا نے حسبِ معمول کھانا پکایا ہو گا اور طاق میں رکھ دیا ہو گا۔۔۔۔

طاق میں پانی کا ایک گلاس پڑا تھا جو جگن ناتھ کا ہاتھ لگنے سے گرنے لگا۔ لیکن جگن ناتھ نے سنبھال لیا اور وہ سمجھ گیا۔ اس نے گلاس اُٹھایا اور ایک سانس میں پینے کے بعد بولا۔۔۔۔۔ ''تیرا شکر ہے مالک''!

اور پھر وہ اندر جا کر لیٹ گیا۔ پانی اس کے کلیجے کو لگ گیا تھا۔ اتفاق کی بات۔ جگن ناتھ نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ بھوکے پیٹ ہی وہ شاستر ارتھ کرتا رہا۔ حالانکہ شاستروں ہی نے شریر کو ہری مندر قرار دے کر اس کی رکھشا مانس کا پرم دھرم لکھا ہے۔۔۔۔ دراصل جگن ناتھ تیاگی پرم اُداس ہو چکا تھا اور دنیا کی کوئی چیز اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ لا سکتی تھی۔ اپنی سمجھ میں وہ بھگوان کی پرستش کر رہا

تھا، لیکن بھگوان تو سمجھتے تھے کہ وہ انسان کی پُوجا کر رہا ہے۔۔۔ اپنی مرحوم بیوی کی، جسے محبت اور صرف محبت کی وجہ سے وہ پیٹا کرتا تھا۔ لیکن اس پر بھی بھگوان نے جگن ناتھ کی حاضری لگالی۔ بھگوان جانتے تھے تاکہ اُن تک پہنچنے کے لیے جس بُت کی پوجا کی جاتی ہے، وہ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ صرف مجھ تک پہنچنے کا ایک بہانہ ہے۔

پیٹ میں درد ہونے کے باوجود جگن ناتھ دھیان میں بیٹھ گئے، جبھی دادی کی آواز آئی۔۔۔۔ "بیٹا"!

جگن ناتھ نے اندھیرے ہی میں مُنہ آواز کی طرف کر دیا اور بولا۔۔۔ "ہاں ماں۔"

"نیند نہیں آتی؟"

"ہاں ماں۔۔۔ نیند نہیں آتی۔"

"کھانا کھالیا؟"

"ہاں ماں۔۔۔۔ بہت کھالیا۔۔۔"

"کوئی چُورن پھکّی لاؤں، بہو کو جگاؤں۔"

"نہیں ماں۔۔۔ میں ایسے ہی سو جاؤں گا۔"

اور جگن ناتھ ایسے ہی سو گیا۔

سویرے بہت شور مچا۔ شیلا تو جانتی تھی کہ اس نے جاتے سمے سسر جی کو کھانا بھی نہیں کھلایا۔ اس لیے وہ سب سے زیادہ اُونچی آواز میں بین کر رہی تھی اور بار بار اپنے مرے ہوئے سسر کے پیروں پر سر پٹخ رہی تھی۔ در حقیقت اس بات کا علم شیلا کو بھی نہ تھا کہ اس کے پتی دیو کے پتا، اتنی سی بات پر اتنے خفا ہو جائیں گے۔ چھوٹی سی بھُول کی اتنی بڑی سزا دیں گے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں آیا ہوا پنشن کا پیسہ بند ہو جائے۔ پتہ نہیں بھگوان نے کس کی کرنی کی سزا کس کو دی۔ اس کی رمزیں وہی جانے۔۔۔ شیلا، جسے اس دنیا سے بھیجنا چاہتی تھی، وہ تو جی رہی تھی۔۔۔

دادی کی وہی حالت ہوئی جو ماں کی ہو سکتی ہے۔ جب جگن ناتھ تیاگی کو لے جانے لگے، ارتھی اُٹھائی گئی، تو دادی یہ کہتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔۔۔ ”ارے! تجھے شرم نہ آئی جگنا۔ میں بوڑھی تیرے کاندھے پر سوار ہو کر جاتی۔ تو جوان ہو کر میرے کندھوں پہ جارہاہے۔“

گلی کا ایک آدمی جو دیکھ رہا تھا، شاہد سے بولا۔۔۔

”کیا فقرہ ہے۔۔۔ کوئی لکھ دے تو لوگ رورو کر پاگل ہو جائیں۔“

شاہد نے ایک تیکھی نظر سے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ”کیسے لکھ دیں، بھائی۔۔۔ اس فقرے کو لکھنے کے لیے بیٹا دینا پڑتا ہے۔“

شیلا تو سمجھتی ہو گی، سسر تو گئے، اب دادی بھی نہ بچ سکے گی۔ دادی کئی دن سکتے میں رہی۔ دیویندر گھر سے نہ گیا۔ اسے دکھانے کے لیے شیلا کو بُڑھیا کی دیکھ ریکھ کرنا ہی پڑتی تھی۔ پہلے تو شیلا نے پاٹھ کرنے کی پروانہ کی۔ لیکن جب اس نے دادی کا زندہ مُردہ گلے پڑتے دیکھا، تو پاٹھ بھی کیا۔ لیکن دادی پھر وہیں کی وہیں

تھی۔ شاید وہ اس منزل پر تھی جہاں گیتا کے پاٹھ بھی اثر نہیں کرتے۔

ہوش میں آتے ہی جو پہلا سوال دادی نے کیا وہ تھا۔۔۔ ''مُنّی کی چٹھی آئی ہے؟''

دیویندر نے دادی کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پچکارتے ہوئے کہا ''نہیں دادی، آ جائے گی تو کیوں فکر کرتی ہے؟''

واقعی وہی ہوا۔ پتا کے مرنے کی خبر مُنّی سوہی کو کہیں ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد ملی، جب کہ داہ سنسکار تو ایک طرف، ہڈیاں بھی گنگا میں بہائی جا چکی تھیں۔ شاید اسی لیے، ابھی بھاگ کر کالے کوسوں سے دیناپور آنا اور آسام کی جونکیں لانا، بیکار کی بات تھی۔ اور جب باپ کی موت کے بعد، مہینوں بعد تک بھی مُنّی نہ آئی تو دادی نے ہنکارتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ارے! مُنّی ہو تو آئے۔۔۔'' جیسے وہیں کسی نے مُنّی کا گلا گھونٹ ڈالا۔

دادی کو دل کی اندرون ترین گہرائیوں سے اس بات کا یقین تھا کہ مُنّی اور گوتم کی انمل، بے جوڑ شادی کبھی نبھ ہی نہیں سکتی۔ مُنّی ابھی لوٹ کے آئی کہ آئی۔

روتی، چلّاتی، سر پیٹتی ہوئی۔۔۔۔

برسات ہو کے ہٹی تھی۔ سورج کی گرمی کے راستے میں ایک بھی تو خاکی ذرّہ حائل نہ ہوتا تھا۔ کرنیں زمین کھود کھود کر اس میں سے کھمبیاں نکال رہی تھیں۔ کچنار کا پیڑ تو سامنے مکان کے سائے میں تھا، اس لیے اس پہ گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ برسات کی پہلی ریزش اور آخری ریزش بھی پیڑ پر لگے ہوئے پھولوں کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ اُلٹا اُس نے کلیوں کے منھ بھی کھول دیے اور اب پورا کچنار ہنستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی ایک ڈال سامنے کھتریوں کے مکان کی کھڑکی میں جا گھُسی تھی، جہاں لال شنیل کا سوٹ پہنے کھتریوں کی بہو کھڑی تھی، جسے چند ہی دن پہلے وہ لکھنؤ سے بیاہ کر لائے تھے۔ لال لال کپڑے، مخملی سوٹ پہنے ہوئے وہ بیر بہوٹی معلوم ہو رہی تھی جو برسات اور اس کے بعد کے تڑاکے میں سے کہیں سے اپنے آپ نکل آتی ہے۔

شاہد کی بہن، فردوس مُنّی کی شادی پر تو نہ آ سکی تھی۔ اب آئی تو مُنّی کے بارے میں پوچھ پوچھ کر اس نے سب کا جینا حرام کر دیا۔ فردوس دادی رُقمن کے پاس

بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی کہ گوراں بھاگی آئی۔۔۔

”دادی۔۔۔ دادی“ وہ بولی ”مُنّی آگئی“!

شیام گلی پُوری کی پُوری اُلٹ پڑی اور مُنّی کو لینے کے لیے آگے بڑھی۔ مُنّی تانگے پر سے اتری اور گوتم کے ساتھ ڈپٹی بھون کی طرف آنے لگی۔ اب وہ چھ فٹ کی تھی اور اس کے ساتھ اس کا پتی گوتم جو سچ مچ، ترمبکا اور گُلّو کی ماں کہنے کے مطابق پہلے سے بھی ٹھگنا اور بونا معلوم ہو رہا تھا۔۔۔ وہ دونوں آ رہے تھے۔۔۔ ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر، کسی بھی احساسات سے عاری۔ جبھی مُنّی اپنے گھر کے پاس پہنچی تو دھپ سے ایک ہاتھ اس کے سر پر پڑا۔

”نیچی، موئی۔۔۔ نیچی۔“

اور مُنّی نے بِلبِلا کر دیکھا۔۔۔ دادی تھڑے پر کھڑی تھی اور اس کا عضو عضو کانپ رہا تھا۔ مُنّی نے ایکا ایکی چِلاّتے ہوئے کہا۔۔۔ ”دادی ی ی ی ی“ اور اس سے لپٹ گئی اور بھینچتے ہوئے بولی۔۔۔ ”باپو کہاں بھیج دیے دادی؟“

دادی نے جگن ناتھ کے بارے میں کچھ نہ سُنا۔ بولی ”گوتم آیا ہے؟“

جبھی گوتم نے آکر دادی کے پیروں پر سر رکھ دیا۔

دادی رُقمن نے مُنہ قریب کر کے، آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور بولی۔۔۔ ”جیتے رہو، جیتے رہو بیٹا، پرماتما۔۔۔“ اور پھر اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی ”آؤ۔۔۔ آؤ میں دادی، آؤ۔۔۔“

ماتم تو کچھ ہی دیر میں ختم ہو گیا۔۔۔۔ دراصل ماتم بھی اُداس ہو گیا تھا اور اب ڈپٹی بھون میں قہقہے لگ رہے تھے۔ صرف شیلا تھی، جسے سسر کی موت کے بعد اتنی جلدی ہنسنا اچھا نہ لگتا تھا۔

دادی نے دیکھا، مُنّی خوش، بہت خوش ہو رہی تھی۔ گوتم، اس کی ماں، اس کے باپ اسے ہاتھوں سے چھاؤں کرتے تھے۔ ہاں، چھاؤں کرنے کے لیے انہیں سیڑھی ضرور لگانا پڑتی تھی۔ دادی کو یہ بھی پتہ چلا مُنّو کو ساتواں مہینہ ہے۔

گوتم جتنے دن بھی رہا، بہت خوش، بہت ہنستا رہا۔ وہ دادی کے ساتھ مذاق کرتا رہا۔

نہ لمبے ہونے کی بات سامنے آئی، نہ چھوٹے ہونے کی۔۔۔ اور پھر وہ مُنّی کو زچگی کے لیے۔۔۔ مائیکے چھوڑ کر، دادی ماں کے پیر چھُوتا ہوا چلا گیا۔

دادی کی بیماری لوٹ آئی۔ ایک دن رات کے دو بجے کھانسی جو آئی تو کتنی دیر تک دم ہی واپس نہ آیا۔ شیلا اور مُنّی پھر دوڑے۔ شیلا تو اب ان سب باتوں کو بے کار سمجھتی تھی، لیکن مُنّی سوہی کا بھگوان پر پُورا وشواس تھا۔ اس نے گوراں کی مدد سے دادی کو نیچے فرش پر اُتارا اور اس کے کان کے پاس مُنہ کر کے بڑی شردھا کے ساتھ نہ صرف گیتا کا سترھواں ادھیائے، بلکہ مہاتم بھی پڑھا۔ اور اس کا پورا پھل دادی کو نمت دیا۔ لیکن دادی ابھی تک جی رہی تھی۔۔۔ اس کے چہرے پہ ایک عجیب قسم کی نورانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر بچّوں کی شرارت چلی آئی۔ اس نے مرگھلے سے انداز میں دائیں اَور دیکھا، جس طرف مُنّی بیٹھی تھی، جو گیتا کو تپائی پر رکھتے ہوئے بڑے غور سے دادی کی سبک سی پرواز دیکھ رہی تھی۔۔۔

"مُنّی" دادی نے نحیف سی آواز میں کہا۔

”ہاں دادی ماں“ مُنّی بولی اور دادی کے مُنہ کے پاس کان کر دیا۔

دادی نے کچھ کہا۔ مُنّی ایک دم شرمائی اور پیچھے ہٹ گئی۔ شیلا پاس کھڑی تھی۔ بائیں طرف گوراں۔۔۔

”کیا پوچھا دادی نے؟“ گوراں بولی۔

”کچھ نہیں“ مُنّی نے کہا اور پھر اور بھی شرما گئی۔ رنگ لال ہو گیا۔

گوراں نے ضد پکڑ لی تو مُنّی بولی ”کہہ رہی تھی ”ہائے ری مُنّو! وہ تُجھ سے پیار کیسے کرتا ہو گا؟“

اور پھر سب نے مُڑ کر دیکھا، دادی رُقمن جیسے پہلے مُسکرا رہی تھی، ویسے ہی اب بھی مُسکرا رہی ہے۔۔۔

اس کے بعد داتاوَرن میں ہوا کا تَتو پَر بل ہو گیا اور تپائی پر پڑی ہوئی گیتا کے پنّے اُڑنے لگے اور اُڑتے اُڑتے وہاں آ کر رُک گئے جہاں شبد سماپت لکھا ہوتا ہے!

اپنے دکھ مجھے دے دو

شادی کی رات بالکل وہ نہ ہوا جو مدن نے سوچا تھا۔ جب چکلی بھابی نے پھسلا کر مدن کو بیچ والے کمرے میں دھکیل دیا تو اندو سامنے شالوں میں لپٹی اندھیرے کا بھاگ بنی جارہی تھی۔ باہر چکلی بھابی اور دریا آباد والی پھوپھی اور دوسری عورتوں کی ہنسی، رات کے خاموش پانیوں میں مصری کی طرح دھیرے دھیرے گھل رہی تھی۔ عورتیں سب یہی سمجھتی تھیں کہ اتنا بڑا ہو جانے پر بھی مدن کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ جب اسے بیچ رات سے جگایا گیا تو وہ ہڑبڑا رہا تھا، ”کہاں، کہاں لئے

جا رہی ہو مجھے ؟"

ان عورتوں کے اپنے اپنے دن بیت چکے تھے۔ پہلی رات کے بارے میں ان کے شریر شوہروں نے جو کچھ کہا اور مانا تھا، اس کی گونج ان کے کانوں میں باقی نہ رہی تھی۔ وہ خود رس بس چکی تھیں اور اب اپنی ایک اور بہن کو بسانے پر تلی ہوئی تھیں۔ زمین کی یہ بیٹیاں مرد کو تو یوں سمجھتی تھیں جیسے بادل کا ٹکڑا ہے جس کی طرف بارش کے لئے منہ اٹھا کر دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ نہ برسے تو منتیں ماننی پڑتی ہیں۔ چڑھاوے چڑھانے پڑتے ہیں۔ جادو ٹونے کرنے ہوتے ہیں۔ حالانکہ مدن کالکا جی کی اس نئی آبادی میں گھر کے سامنے کی جگہ میں پڑا اسی وقت کا منتظر تھا۔ پھر شامتِ اعمال پڑوسی سبطے کی بھینس اس کی کھاٹ ہی کے پاس بندھی تھی جو بار بار پھنکارتی ہوئی مدن کو سونگھ لیتی تھی اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔ ایسے میں بھلا نیند کا سوال ہی کہاں تھا؟

سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے سے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا

قدم کہاں رکھتا ہے۔ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔ کچھ دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر پلنگ کو کھینچ کر چاندنی میں کر دیا تاکہ دلہن کا چہرہ تو دیکھ سکے۔ پھر وہ ٹھٹک گیا۔ جب اس نے سوچا اندو میری بیوی ہے۔ کوئی پرائی عورت تو نہیں جسے نہ چھونے کا سبق بچپن ہی سے پڑھتا آیا ہوں۔ شالوں میں لپٹی ہوئی دلہن کو دیکھتے ہوئے اس نے فرض کر لیا، وہاں اندو کا منہ ہو گا۔ اور جب ہاتھ بڑھا کر اس نے پاس پڑی گٹھڑی کو چھوا تو وہیں اندو کا منہ تھا۔ مدن نے سوچا تھا وہ آسانی سے مجھے اپنا آپ نہ دیکھنے دے گی لیکن اندو نے ایسا نہ کیا۔ جیسے پچھلے کئی سالوں سے وہ بھی اسی لمحے کی منتظر ہو اور کسی خیالی بھینس کے سونگھتے رہنے سے اسے بھی نیند نہ آ رہی ہو۔ غائب نیند اور بند آنکھوں کا کرب اندھیرے کے باوجود سامنے پھڑ پھڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی تک پہنچتے ہوئے عام طور پہ چہرہ لمبوترا ہو جاتا ہے لیکن یہاں تو سبھی گول تھا۔ شاید اسی لئے چاندنی کی طرف گال اور ہونٹوں

کے بیچ ایک سائے دار کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ جیسی دو سر سبز اور شاداب ٹیلوں کے بیچ ہوتی ہے۔ ماتھا کچھ تنگ تھا لیکن اس پر سے ایکا ایکی اٹھنے والے گھنگھریالے بال۔

جبھی اندو نے اپنا چہرہ چھڑا لیا جیسے وہ دیکھنے کی اجازت تو دیتی ہو لیکن اتنی دیر کے لئے نہیں۔ آخر شرم کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔ مدن نے ذرا سخت ہاتھوں سے یوں ہی سی ہوں ہاں کرتے ہوئے دلہن کا چہرہ پھر سے اوپر کو اٹھا دیا اور شرابی سی آواز میں کہا، ''اندو''!

اندو کچھ ڈر سی گئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی اجنبی نے اس کا نام اس انداز سے پکارا تھا اور وہ اجنبی کسی خدائی حق سے رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ اس اکیلی بے یار و مددگار عورت کا اپنا ہوتا جا رہا تھا۔ اندو نے پہلی بار ایک نظر اوپر دیکھتے ہوئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور صرف اتنا سا کہا، ''جی'' اسے خود اپنی آواز کسی پاتال سے آتی ہوئی سنائی دی۔

دیر تک کچھ ایسا ہی ہوتا رہا اور پھر ہولے ہولے بات چل نکلی۔ اب جو چلی سو چلی۔ وہ تھمنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اندو کے پتا، اندو کی ماں، اندو کے بھائی، مدن کے بھائی بہن، باپ، ان کی ریلوے سیل سروس کی نوکری، ان کے مزاج، کپڑوں کی پسند، کھانے کی عادت، سبھی کا جائزہ لیا جانے لگا۔ بیچ بیچ میں مدن بات چیت کو توڑ کر کچھ اور ہی کرنا چاہتا تھا لیکن اندو طرح دے جاتی تھی۔ انتہائی مجبوری اور لاچاری میں مدن نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا جو اسے سات سال کی عمر میں چھوڑ کر دق کے عارضے سے چلتی بنی تھی۔ "جتنی دیر زندہ رہی بیچاری" مدن نے کہا، "بابو جی کے ہاتھ میں دوائی کی شیشیاں رہیں۔ ہم اسپتال کی سیڑھیوں پر اور چھوٹا پاشی گھر میں چیونٹیوں کے بل پر سوتے رہے اور آخر ایک دن ۲۸ مارچ کی شام،" اور مدن چپ ہو گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ رونے سے ذرا ادھر اور گھِگھی سے ذرا ادھر پہنچ گیا۔ اندو نے گھبرا کر مدن کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اس رونے نے پل بھر میں اندو کو اپنے پن سے ادھر اور بیگانے پن سے ادھر پہنچا دیا تھا۔۔۔ مدن اندو کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا لیکن اندو نے اس کے ہاتھ پکڑ

لئے اور کہا، ”میں تو پڑھی لکھی نہیں ہوں جی، پر میں نے ماں باپ دیکھے ہیں، بھائی اور بھابھیاں دیکھی ہیں، بیسیوں اور لوگ دیکھے ہیں۔ اس لئے میں کچھ سمجھتی بوجھتی ہوں میں اب تمہاری ہوں اپنے بدلے میں تم سے ایک ہی چیز مانگتی ہوں۔“

روتے وقت اور اس کے بعد بھی ایک نشہ سا تھا۔ مدن نے کچھ بے صبری اور کچھ دریادلی کے ملے جلے شبدوں میں کہا، ”کیا مانگتی ہو؟ تم جو بھی کہو گی میں دوں گا۔“

”پکی بات؟“ اندو بولی۔

مدن نے کچھ اتاولے ہو کر کہا، ”ہاں ہاں کہا جو پکی بات۔“

لیکن اس بیچ میں مدن کے من میں ایک وسوسہ آیا۔ میرا کاروبار پہلے ہی مندا ہے، اگر اندو کوئی ایسی چیز مانگ لے جو میری پہنچ ہی سے باہر ہو تو پھر کیا ہو گا؟ لیکن اندو نے مدن کے سخت اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے ان پر اپنے گال رکھتے ہوئے کہا،

"تم اپنے دکھ مجھے دو۔"

مدن سخت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اپنے آپ پر ایک بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے چاندنی میں ایک بار پھر اندو کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ جان پایا۔ اس نے سوچا یہ ماں یا کسی سہیلی کا رٹا ہوا فقرہ ہو گا جو اندو نے کہہ دیا۔ جبھی یہ جلتا ہوا آنسو مدن کے ہاتھ کی پشت پر گرا۔ اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا، "دیئے!" لیکن ان سب باتوں نے مدن سے اس کی بہیمیت چھین لی تھی۔

مہمان ایک ایک کر کے سب رخصت ہوئے۔ چکلی بھابھی دو بچوں کو انگلیوں سے لگائے سیڑھیوں کی اونچ نیچ سے تیسرا پیٹ سنبھالتی ہوئی چل دی۔ دریا آباد والی پھوپھی جو اپنے 'نو لکھے' ہار کے گم ہو جانے پر شور مچاتی واویلا کرتی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور جو غسل خانے میں پڑا ہوا مل گیا تھا، جہیز میں سے اپنے حصّے کے تین کپڑے لے کر چلی گئی۔ پھر چاچا گئے۔ جن کو ان کے جے پی ہو جانے کی خبر تار کے ذریعے ملی تھی اور جو شاید بدحواسی میں مدن کی بجائے دلہن کا منہ چومنے چلے تھے۔

گھر میں بوڑھا باپ رہ گیا تھا اور چھوٹے بہن بھائی۔ چھوٹی دلاری تو ہر وقت بھابی کی ہی بغل میں گھسی رہتی۔ گلی محلے کی کوئی عورت دلہن کو دیکھے یا نہ دیکھے۔ دیکھے تو کتنی دیر دیکھے۔ یہ سب اس کے اختیار میں تھا۔ آخر یہ سب ختم ہوا اور آہستہ آہستہ پرانی ہونے لگی لیکن کاکا جی کی اس نئی آبادی کے لوگ اب بھی آتے جاتے۔ مدن نواس کے سامنے رُک جاتے اور کسی بھی بہانے سے اندر چلے آتے۔ اندوا نہیں دیکھتے ہی ایک دم گھونگٹ کھینچ لیتی لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں جو کچھ دکھائی دے جاتا وہ بنا گھونگٹ کے دکھائی ہی نہ دے سکتا تھا۔

مدن کا کاروبار گندے بروزے کا تھا۔ کہیں بڑی سپلائی والے دو تین جنگلوں میں چیڑ اور دیودار کے پیڑوں کی جنگل میں آگ نے آلیا تھا اور وہ دھڑا دھڑ جلتے ہوئے خاک سیاہ ہو کر رہ گئے تھے۔ میسور اور آسام کی طرف سے منگوایا ہوا بیروزہ مہنگا پڑتا تھا اور لوگ اسے مہنگے داموں خریدنے کو تیار نہ تھے۔ ایک تو آمدنی کم ہو گئی تھی۔ اس پر مدن جلدی ہی دکان اور اس کے ساتھ والا دفتر بند کر کے گھر چلا آتا۔ گھر پہنچ کر اس کی ساری کوشش یہی ہوتی کہ سب کھائیں پئیں

اور اپنے اپنے بستروں میں دبک جائیں۔ جب وہ کھاتے وقت خود تھالیاں اٹھا اٹھا کر باپ اور بہن کے سامنے رکھتا اور ان کے کھا چکنے کے جھوٹے برتنوں کو سمیٹ کر نل کے نیچے رکھ دیتا۔ سب سمجھتے بہو، بھابی نے مدن کے کان میں کچھ پھونکا ہے اور اب وہ گھر کے کام کاج میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ مدن سب سے بڑا تھا۔ کندن اس سے چھوٹا اور پاشی سب سے چھوٹا۔ جب کندن بھابی کے سواگت میں سب کے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے پر اصرار کرتا تو باپ دھنی رام وہیں ڈانٹ دیتا۔

"کھاؤ تم" وہ کہتا، "وہ بھی کھالیں گے" اور پھر رسوئی میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور جب بہو کھانے پینے سے فارغ ہو جاتی اور برتنوں کی طرف متوجہ ہوتی تو بابو دھنی رام اسے روکتے ہوئے کہتے، "رہنے دے بہو برتن صبح ہو جائیں گے۔"

اندو کہتی، "نہیں بابو جی میں ابھی کئے دیتی ہوں جھپاکے سے۔"

تب بابو دھنی رام ایک لرزتی ہوئی آواز میں کہتے، "مدن کی ماں ہوتی بہو، تو یہ سب تمہیں نہ کرنے دیتی؟" اور اندو ایک دم اپنے ہاتھ روک لیتی۔

چھوٹا پاشی بھابی سے شرماتا تھا۔ اس خیال سے کہ دلہن کی گود جھٹ سے ہری ہو، چمکی بھابی اور دریاباد والی پھوپھی نے ایک رسم میں پاشی ہی کو اندو کی گود میں ڈالا تھا۔ جب سے اندو اسے نہ صرف دیور بلکہ اپنا بچہ سمجھنے لگی تھی۔ جب بھی وہ پیار سے پاشی کو اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کرتی تو وہ گھبرا اٹھتا اور اپنا آپ چھڑا کر دو ہاتھ کی دوری پر کھڑا ہو جاتا۔ دیکھتا اور ہنستا رہتا۔ پاس آتا تو دور ہٹتا۔ ایک عجیب اتفاق سے ایسے میں بابو جی ہمیشہ وہیں موجود ہوتے اور پاشی کو ڈانٹتے ہوئے کہتے، ”ارے جانا بھابی پیار کرتی ہے ابھی سے مرد ہو گیا تو؟“ اور دلاری تو پیچھا ہی نہ چھوڑتی اس کا۔ ”میں تو بھابی کے ساتھ ہی سوؤں گی“ کے اصرار نے بابو جی کے اندر کوئی جنار دھن جگا دیا تھا۔ ایک رات اس بات پر دلاری کو زور سے چپت پڑی اور وہ گھر کی آدھی کچی، آدھی پکی نالی میں جا گری۔ اندو نے لپکتے ہوئے پکڑا تو سر سے دوپٹہ اڑ گیا۔ بالوں کے پھول اور چڑیاں، مانگ کا سیندور، کانوں کے کرن پھول سب ننگے ہو گئے۔ ”بابو جی۔“ اندو نے سانس کھینچتے ہوئے کہا، ایک ساتھ دلاری کو پکڑنے اور سر پر دوپٹہ اوڑھنے میں اندو کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس بے

ماں کی بچی کو چھاتی سے لگائے ہوئے اندو نے اسے ایک ایسے بستر میں سلا دیا جہاں سرہانے ہی سرہانے، تکئے ہی تکئے تھے۔ نہ کہیں پائنتی تھی نہ کاٹھ کے بازو۔ چوٹ تو ایک طرف کہیں کو چبھنے والی چیز بھی نہ تھی۔ پھر اندو کی انگلیاں دلاری کے پھوڑے ایسے سر پر چلتی ہوئی اسے دکھا بھی رہی تھیں اور مزا بھی دے رہی تھیں۔ دلاری کے گالوں پر بڑے بڑے اور پیارے پیارے گڑھے پڑتے تھے۔ اندو نے ان گڑھوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، "ہائے ری منی! تیری ساس مرے، کیسے گڑھے پڑ رہے ہیں گالوں پر"!

منی نے منی کی طرح کہا، "گڑھے تمہارے بھی تو پڑتے ہیں بھابی۔"

"ہاں منو!" اندو نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔

مدن کو کسی بات پر غصّہ تھا۔ وہ پاس ہی کھڑا سب کچھ سن رہا تھا، "میں تو کہتا ہوں ایک طرح سے اچھا ہی ہے۔"

"کیوں اچھا کیوں ہے؟" اندو نے پوچھا۔

”نہ اگے بانس نہ بجے بانسری، سانس نہ ہو تو کوئی جھگڑا نہیں رہتا۔“ اندو نے ایکا ایکی خفا ہوتے ہوئے کہا، ”تم جاؤ جی سو رہو جا کر۔ بڑے آئے ہو آدمی جیتا ہے تو لڑتا ہے نا؟ مرگھٹ کی چپ چاپ سے جھگڑے بھلے۔ جاؤ نہ رسوئی میں تمہارا کیا کام؟“

مدن کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ بابو دھنی رام کی ڈانٹ سے باقی بچے تو پہلے ہی اپنے اپنے بستروں میں یوں جا پڑے تھے جیسے دفتروں میں چھٹیاں سٹارٹ ہوتی ہیں۔ لیکن مدن وہیں کھڑا رہا۔ احتیاج نے اسے ڈھیٹ اور بے شرم بنا دیا تھا لیکن اس وقت جب اندو نے بھی اسے ڈانٹ دیا تو وہ روہانسا ہو کر اندر چلا گیا۔ دیر تک مدن بستر میں پڑا کسمساتا رہا لیکن بابو جی کے خیال سے اندو کو آواز دینے کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ اس کی بے صبری کی حد ہو گئی تھی۔ جب منی کو سلانے کے لئے اندو کی لوری کی آواز سنائی دی ”تو آنندیا رانی، بورائی مستانی۔“

وہی لوری جو دلاری منی کو سلا رہی تھی، مدن کی نیند بھگا رہی تھی۔ اپنے آپ سے بیزار ہو کر اس نے زور سے چادر سر پر کھینچ لی۔ سفید چادر کے سر پر لپیٹنے اور

سانس کے بند کرنے سے خواہ مخواہ ایک مردے کا تصور پیدا ہو گیا۔ مدن کو یوں لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اس کی دلہن اندو اس کے پاس بیٹھی زور زور سے سر پیٹ رہی ہے، دیوار کے ساتھ کلائیاں مار مار کر چوڑیاں توڑ رہی ہے اور پھر باہر لپک جاتی ہے اور بانہیں اٹھا اٹھا کر گلی محلے کے لوگوں سے فریاد کرتی ہے، ”لوگو! میں لٹ گئی۔“ اب اسے دوپٹے کی پرواہ نہیں۔ قمیض کی پرواہ نہیں۔ مانگ کا سیندور، بالوں کے پھول اور چوڑیاں، جذبات اور خیالات کے طوطے تک اڑ چکے ہیں۔

مدن کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہہ رہے تھے۔ حالانکہ رسوئی میں اندو ہنس رہی تھی۔ پل بھر میں اپنے سہاگ کے اُجڑنے اور پھر بس جانے سے بے خبر۔ مدن جب حقائق کی دنیا میں واپس آیا تو آنسو پونچھتے ہوئے اپنے اس رونے پر ہنسنے لگا ادھر اندو تو ہنس رہی تھی لیکن اس کی ہنسی دبی دبی تھی۔ بابو جی کے خیال سے وہ کبھی اونچی آواز میں نہ ہنستی تھی جیسے کھکھلاہٹ کوئی ننگا پن ہے، خاموشی، دوپٹہ اور دبی دبی ہنسی ایک گھونگٹ۔ پھر مدن نے اندو کا ایک خیالی بت بنایا اور اس سے بیسیوں باتیں کر ڈالیں۔ یوں اس سے پیار کیا جیسے ابھی تک نہ کیا تھا وہ پھر

اپنی دنیا میں لوٹا جس میں ساتھ کا بستر خالی تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی اندو ایک اونگھ سی آئی لیکن ساتھ ہی یوں لگا جیسے شادی کی رات والی، پڑوسی سبطے کی بھینس منہ کے پاس پھنکارنے لگی ہے۔ وہ ایک بے کلی کے عالم میں اٹھا، پھر رسوئی کی طرف دیکھتے، سر کو کھجاتے ہوئے دو تین جمائیاں لے کر لیٹ گیا۔ سو گیا۔۔۔

مدن جیسے کانوں کو کوئی سندیسہ دے کر سویا تھا۔ جب اندو کی چوڑیاں بستر کی سلوٹیں سیدھی کرنے سے کھنک اٹھیں تو وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ یوں ایک دم جاگنے میں محبت کا جذبہ اور بھی تیز ہو گیا تھا۔ پیار کی کروٹوں کو توڑے بغیر آدمی سو جائے اور ایکا ایکی اٹھے تو محبت دم توڑ دیتی ہے۔ مدن کا سارا بدن اندر کی آگ سے پھنک رہا تھا اور یہی اس کے غصّے کا کارن بن گیا۔ جب اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا، ''تو تم آ گئیں؟''

''ہاں۔''

"منی۔۔۔ سو مر گئی؟"

اندو جھکی جھکی ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "ہائے رام" اس نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے ہاتھ ملتے ہوئے کہا، "کیا کہہ رہے ہو، مرے کیوں بیچاری۔ ماں باپ کی ایک نہ ہی بیٹی۔"

"ہاں۔۔۔" مدن نے کہا، "بھابھی کی ایک ہی نند۔" اور ایک دم تحکمانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا، "زیادہ منہ مت لگاؤ اس چڑیل کو۔"

"کیوں اس میں کیا پاپ ہے؟"

"یہی پاپ ہے" مدن نے اور چڑتے ہوئے کہا، "وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تمہارا۔ جب دیکھو جونک کی طرح چمٹی ہوئی ہے۔ دفان ہی نہیں ہوتی۔"

"ہا۔۔۔" اندو نے مدن کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "بہنوں اور بیٹیوں کو یوں تو دھتکارنا نہیں چاہیئے۔ بیچاری دو دن کی مہمان۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ ایک دن تو چل ہی دے گی۔" اس کے بعد اندو کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن

وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ، بھائی بہن چچا بھی گھوم گئے۔ کبھی وہ بھی ان کی دلاری تھی۔ جو پلک جھپکتے ہی نیاری ہو گئی۔ اور پھر دن رات اس کے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں۔ جیسے گھر میں کوئی بڑی سی باہنی ہے جس میں کوئی ناگن رہتی ہے اور جب تک وہ پکڑ کر پھنکوائی نہیں جاتی۔ گھر کے لوگ آرام کی نیند سو نہیں سکتے۔ دور دور سے کیلنے والے لتھن کرنے والے۔ دانت چھوڑنے والے ماندری بلوائے گئے اور بڑے دھنونتری اور موتی ساگر۔ آخر ایک دن اتر پچھم کی طرف سے لال آندھی آئی جو صاف ہوئی تو ایک لاری کھڑی تھی جس میں گوٹے کنری میں لپٹی ہوئی ایک دلہن بیٹھی تھی۔ پیچھے گھر میں ایک سر پر بجھتی ہوئی شہنائی بین کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔ پھر ایک دھچکے کے ساتھ لاری چل دی۔ مدن نے کچھ برافروختگی کے عالم میں کہا، ”تم عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہو۔ ابھی کل ہی اس گھر میں آئی ہو اور یہاں کے سب لوگ تمھیں ہم سے زیادہ پیار کرنے لگے ہیں؟“

”ہاں!“ اندو نے اثبات میں کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تمہارا مطلب ہے میں۔۔۔"

"دکھاوا ہے یہ سب۔۔۔ہاں"!

"اچھا جی؟" اندو نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا، "یہ سب دکھاوا ہے میرا؟" اور اندو اٹھ کر اپنے بستر میں چلی گئی اور سرہانے میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ مدن اسے منانے والا ہی تھا کہ اندو خود ہی اٹھ کر مدن کے پاس آگئی اور سختی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی، "تم جو ہر وقت جلی کٹی کہتے رہتے ہو، ہوا کیا ہے تمہیں؟" شوہرانہ رعب داب کے لیے مدن کے ہاتھ بہانہ آگیا۔۔۔
"جاؤ، جاؤ۔۔۔ سو جاؤ جا کے۔" مدن نے کہا "مجھے تم سے کچھ نہیں لینا۔"

"تمہیں کچھ نہیں لینا مجھے تو لینا ہے۔" اندو بولی۔ "زندگی بھر لینا ہے" اور وہ چھینا جھپٹی کرنے لگی۔ مدن اسے دھتکارتا تھا اور وہ اس سے لپٹ لپٹ جاتی تھی۔ وہ اس مچھلی کی طرح تھی جو بہاؤ میں بہہ جانے کی بجائے آبشار کے تیز دھارے کو

کاٹتی ہوئی اوپر ہی اوپر پہنچانا چاہتی ہو۔

چٹکیاں لیتے ہوئے، ہاتھ پکڑتی، روتی ہنستی وہ کہہ رہی تھی۔

"پھر مجھے پھاپھاکٹنی کہو گے؟"

"وہ تو سبھی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"ٹھہرو تمہاری تو" یوں معلوم ہوا جیسے اندو کوئی گالی دینے والی ہو اور اس نے منہ میں کچھ منمنایا بھی۔ مدن نے مڑتے ہوئے کہا، "کیا کہا؟" اور اندو نے اب کی سنائی دینے والی آواز میں دہرایا۔ مدن کھکھلا کر ہنس پڑا۔ اگلے ہی لمحے اندو مدن کے بازوؤں میں تھی اور کہہ رہی تھی "تم مرد لوگ کیا جانو؟ جس سے پیار ہوتا ہے اس کے سبھی عزیز پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا باپ کیا بھائی اور کیا بہن" اور ایکا ایکی کہیں دور سے دیکھتے ہوئے بولی، "میں تو دلاری منی کا بیاہ کروں گی۔"

"حد ہو گئی" مدن نے کہا، "ابھی ایک ہاتھ کی ہوئی نہیں اور بیاہ کی سوچنے لگیں۔"

"تمھیں ایک ہاتھ کی لگتی ہے نا؟" اندو بولی اور پھر اپنے ہاتھ مدن کی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہنے لگی، "ذرا آنکھیں بند کرو اور پھر کھولو۔" مدن نے سچ مچ ہی آنکھیں بند کرلیں اور جب کچھ دیر تک نہ کھولیں تو اندو بولی، "اب کھولو بھی اتنی دیر میں تو میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔" جبھی مدن نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحہ بھر کے لئے اسے یوں لگا جیسے سامنے اندو نہیں منی بیٹھی ہے اور وہ کھو سا گیا۔

"میں نے تو ابھی سے چار سوٹ اور کچھ برتن الگ کرڈالے ہیں اس کے لئے" اور جب مدن نے کوئی جواب نہ دیا تو اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی، "تم کیوں پریشان ہوتے ہو یاد نہیں اپنا وچن؟ تم اپنے دکھ مجھے دے چکے ہو۔"

"ایں؟" مدن نے چونکتے ہوئے کہا اور جیسے بے فکر ہو گیا لیکن اب کے جب اس نے اندو کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہاں ایک جسم ہی نہیں رہ گیا تھا ساتھ ایک روح بھی شامل ہو گئی تھی۔

مدن کے لئے اندو روح ہی روح تھی۔ اندو کا جسم بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ کسی نہ کسی

وجہ سے مدن کی نظروں سے اوجھل ہی رہا۔ ایک پردہ تھا۔ خواب کے تاروں سے بنا ہوا۔ آہوں کے دھوئیں سے رنگین قہقہوں کی زرتاری سے چکاچوند جو ہر وقت اندو کو ڈھانپے رہتا تھا۔ مدن کی نگاہوں اور اس کے ہاتھوں کے دوشاسن صدیوں سے اس دروپدی کا چیر ہرن کرتے آئے تھے جو کہ عرفِ عام میں بیوی کہلاتی ہے لیکن ہمیشہ اسے آسمانوں سے تھانوں کے تھان، گزوں کے گز، کپڑا ننگا پن ڈھانپنے کے لئے ملتا آیا تھا۔ دوشاسن تھک ہار کے یہاں وہاں گرے پڑے تھے لیکن دروپدی وہیں کھڑی تھیں، عزت اور پاکیزگی کی ایک سفید اور بے داغ ساری میں ملبوس وہ دیوی لگ رہی تھی اور مدن کے لوٹتے ہوئے ہاتھ خجالت کے پسینے سے تر ہوئے، جسے سکھانے کے لئے وہ انہیں اوپر ہوا میں اٹھا دیتا اور پھر ہاتھ کے پنجوں کو پورے طور پر پھیلا تا ہوا، ایک تشنجی کیفیت میں اپنی آنکھوں کی پھیلتی پھٹتی ہوئی پتلیوں کو سامنے رکھ دیتا۔ اور پھر انگلیوں کے بیچ میں سے جھانکتا اندو کا مرمریں جسم خوش رنگ اور گداز سامنے پڑا ہوتا۔ استعمال کے لئے پاس، ابتذال کے لئے دور۔۔۔ کبھی جب اندو کی ناکہ بندی ہو جاتی تو اس قسم کے

فقرے ہوتے۔۔۔

”ہائے جی، گھر میں چھوٹے بڑے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے ؟“

مدن کہتا، ”چھوٹے سمجھتے نہیں بڑے انجان بن جاتے ہیں۔“

اسی دوران میں بابو دھنی رام کی تبدیلی سہارنپور ہو گئی۔ وہاں وہ ریلوے میل سروس میں سلیکشن گریڈ کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ اتنا بڑا کوارٹر ملا کہ اس میں آٹھ کنبے رہ سکتے تھے لیکن بابو دھنی رام اس میں اکیلے ہی ٹانگیں پھیلائے کھڑے رہتے۔ زندگی بھر وہ بال بچوں سے کبھی علیٰحدہ نہیں ہوئے تھے۔ سخت گھریلو قسم کے آدمی۔ آخری زندگی میں اس تنہائی نے ان کے دل میں وحشت پیدا کر دی لیکن مجبوری تھی، بچے سب دلی میں مدن اور اندو کے پاس تھے اور وہیں اسکول میں پڑھتے تھے۔ سال کے خاتمے سے پہلے انہیں بیچ میں اٹھانا ان کی پڑھائی کے لئے اچھا نہ تھا۔ بابو جی کے دل کے دورے پڑنے لگے۔

بارے گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ ان کے بار بار لکھنے پر مدن نے اندو کو کندن، پاشی

اور دلاری کے ساتھ سہارنپور بھیج دیا، دھنی رام کی دنیا چمک اٹھی۔ کہاں انہیں دفتر کے کام کے بعد فرصت ہی فرصت تھی اور کہاں اب کام ہی کام تھا۔ بچے بچوں ہی کی طرح جہاں کپڑے اتارتے ہیں وہیں پڑے رہنے دیتے اور بابو جی انہیں سمیٹتے پھرتے۔ اپنے مدن سے دور السائی ہوئی رہتی، اندو تو اپنے پہناوے تک سے غافل ہو گئی تھی۔ وہ رسوئی میں یوں پھرتی تھی جیسے کانجی ہاؤس میں گائے، باہر کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر اپنے مالک کو ڈھونڈا کرتی ہو۔ کام وام کرنے کے بعد وہ کبھی اندر ٹرنکوں پر لیٹ جاتی۔ کبھی باہر کنیر کے بوٹے کے پاس اور کبھی آم کے پیڑ تلے جو آنگن میں کھڑا سینکڑوں ہزاروں دلوں کو تھامے ہوئے تھا۔

ساون بھادوں میں ڈھلنے لگا۔ آنگن میں سے باہر کا دریچہ کھلتا تو کنواریاں، نئی بیاہی ہوئی لڑکیاں پینگ بڑھاتے ہوئے گاتیں جھولا کن نے ڈارو رے امریاں اور پھر گیت کے بول کے مطابق دو جھولتیں اور دو جھلاتیں اور کہیں چار مل جاتیں تو بھول بھلیاں ہو جاتیں۔ ادھیڑ عمر کی بوڑھی عورتیں ایک طرف کھڑی تکا

کرتیں۔ اندو کو معلوم ہوتا جیسے وہ بھی ان میں شامل ہو گئی ہے۔ جبھی وہ منہ پھیر لیتی اور ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی سو جاتی۔ بابو جی پاس سے گزرتے تو اسے جگانے، اٹھانے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتے۔ بلکہ موقع نہ پا کر اس شلوار کو جو بہو دھوتی سے بدل آتی اور جسے وہ ہمیشہ اپنی ساس والے پرانے صندل کے صندوق پر پھینک دیتی، اٹھا کر کھونٹی پر لٹکا دیتے۔ ایسے میں انہیں سب سے نظریں بچانا پڑتیں لیکن ابھی شلوار کو سمیٹ کر مڑتے ہی تو نیچے کونے میں نگاہ بہو کے محرم پر پڑ جاتی۔ تب ان کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ شتابی کمرے سے نکل بھاگتے۔ جیسے سانپ کا بچہ بل سے باہر آ گیا ہو۔ پھر برآمدے میں ان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اوم نموم بھگوتے واسو دیوا۔۔۔

اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچا دی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے، ”ہم تو دھنیہ ہو گئے، امی چند کی ماں! شکر ہے ہمارے گھر میں بھی کوئی صحت والا جیو آیا۔“ اور یہ کہتے

ہوئے ان کی نگاہیں کہیں دور پہنچ جاتیں۔ جہاں دق کے عارضے تھے۔ دوائی کی شیشیاں، اسپتال کی سیڑھیاں یا چیونٹیوں کے بل، نگاہ قریب آتی تو موٹے موٹے گدرائے ہوئے جسم والے کئی بچے بغل میں جانگھ پر، گردن پر چڑھتے اترتے ہوئے محسوس ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے ابھی اور آرہے ہیں۔ پہلو پر لیٹی ہوئی بہو کی کمر زمین کے ساتھ اور کولہے چھت کے ساتھ لگ رہے ہیں اور وہ دھڑا دھڑ بچے جنتی جارہی ہے اور ان بچوں کی عمر میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ سبھی ایک سے جڑواں۔۔۔ توام اوم نمو بھگوتے۔

آس پاس کے سب لوگ جان گئے تھے۔ اندو بابو جی کی چہیتی بہو ہے۔ چنانچہ دودھ اور چھاچھ کے مٹکے دھنی رام کے گھر آنے لگے اور پھر ایک دم سلام دین گوجر نے فرمائش کر دی۔ اندو سے کہا، ''بی بی میرا بیٹا آر۔ ایم۔ ایس میں قلی رکھوا دو۔ اللہ تم کو اچھا دے گا۔'' اندو کے اشارے کی دیر تھی کہ سلام دین کا بیٹا نوکر ہو گیا۔ وہ بھی سارٹر، جو نہ ہو سکا اس کی قسمت، آسامیاں زیادہ نہ تھیں۔

بہو کے کھانے پینے اور اس کی صحت کا بابو جی خیال رکھتے تھے۔ دودھ پینے سے

اندو کو چڑ تھی۔ وہ رات کے وقت خود دودھ کو بالائی میں پھینٹ، گلاس میں ڈال، بہو کو پلانے کے لئے اس کی کھٹیا کے پاس آجاتے۔ اندو اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھتی اور کہتی۔ ”نہیں بابو جی مجھ سے نہیں پیا جاتا۔“

”تیرا تو سسر بھی پیئے گا۔“ وہ مذاق سے کہتے، ”تو پھر آپ پی لیجیئے نا۔“ اندو ہنستی ہوئی جواب دیتی اور بابو جی ایک مصنوعی غصّے سے برس پڑتے، ”تو چاہتی ہے بعد میں تیری بھی وہی حالت ہو جو تیری ساس کی ہوئی؟“

ہوں۔۔۔ ہوں اندو لاڈ سے روٹھنے لگی۔ آخر کیوں نہ رُوٹھی۔ وہ لوگ نہیں روٹھتے جنہیں منانے والا کوئی نہ ہو لیکن یہاں منانے والے سب تھے، روٹھنے والا صرف ایک۔ جب اندو بابو جی کے ہاتھ سے گلاس نہ لیتی تو وہ اسے کھٹیا کے پاس سرہانے کے نیچے رکھ دیتے اور ”لے یہ پڑا ہے، تیری مرضی ہے تو پی نہیں مرضی تو نہ پی“ کہتے ہوئے چل دیتے۔

اپنے بستر پر پہنچ کر دھنی رام دلاری منی کے پاس کھیلنے لگتے۔ دلاری کو بابو جی کے

ننگے پنڈے کے ساتھ پنڈا گھسانے اور پھر پیٹ پر منہ رکھ کر پھنکڑا اچھلانے کی عادت تھی۔ آج جب بابو جی اور منی یہ کھیل کھیل رہے تھے۔ ہنس ہنسا رہے تھے، تو منی نے بھابی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''دودھ تو خراب ہو جائے گا بابو جی۔ بھابی تو پیتی ہی نہیں۔''

''پئے گی ضرور پئے گی بیٹا،'' بابو جی نے دوسرے ہاتھ سے پاشی کو لپٹاتے ہوئے کہا، ''عورتیں گھر کی کسی چیز کو خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔''

ابھی یہ فقرہ بابو جی کے منہ ہی میں ہوتا کہ ایک طرف سے ''ہش ہے خصم کھانی'' کی آواز آنے لگتی۔ پتہ چلتا بہو بلی کو بھگا رہی ہے اور پھر غٹ غٹ سی سنائے دیتی اور سب جان لیتے بہو بھابی نے دودھ پی لیا۔ کچھ دیر کے بعد کندن بابو جی کے پاس آتا اور کہتا، ''بو جی بھابی رو رہی ہے۔''

''ہائیں؟'' بابو جی کہتے اور پھر اٹھ کر اندھیرے میں دور اسی طرف دیکھنے لگتے جدھر بہو کی چارپائی پڑی ہوتی۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر لیٹ

جاتے اور کچھ سمجھتے ہوئے کندن سے کہتے ''جا تو سو جا وہ بھی سو جائے گی اپنے آپ۔''

اور پھر لیٹتے ہوئے بابو دھنی رام آسمان پر کھلے ہوئے پرماتما کے گلزار کو دیکھنے لگتے اور اپنے من میں بھگوان سے پوچھتے ''چاندی کے ان کھلتے بند ہوتے ہوئے پھولوں میں میرا پھول کہاں ہے؟'' اور پھر پورا آسمان انہیں درد کا ایک دریا دکھائی دینے لگتا اور کانوں میں مسلسل ایک ہاؤ کی آواز سنائی دیتی جسے سنتے ہوئے وہ کہتے۔ ''جب سے دنیا بنی ہے انسان کتنا رویا ہے!'' اور روتے روتے سو جاتے۔

اندو کے جانے سے بیس پچیس روز ہی میں مدن نے واویلا شروع کر دیا۔ اس نے لکھا۔ میں بازار کی روٹیاں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ مجھے قبض ہو گئی ہے۔ گردے کا درد شروع ہو گیا ہے۔ پھر جیسے دفتر کے لوگ چھٹی کی عرضی کے ساتھ ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھیج دیتے ہیں۔ مدن نے بابو جی کو ایک دوسرے سے تصدیق کی چھٹی لکھوا بھیجی۔ اس پر بھی جب کچھ نہ ہوا تو ایک ڈبل تار جوابی۔

جوابی تار کے پیسے مارے گئے لیکن بلا سے۔ اندو اور بچے لوٹ آئے تھے۔ مدن نے اندو سے دو دن سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ یہ دکھ بھی اندو ہی کا تھا۔ ایک دن مدن کو اکیلے میں پا کر وہ پکڑ بیٹھی اور بولی، "اتنا منہ پھُلائے بیٹھے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

مدن نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا "چھوڑ۔۔۔ دور ہو جا میری آنکھوں سے کمینی۔۔۔"

"یہی کہنے کے لئے اتنی دور سے بُلوایا ہے؟"

"ہاں"!

"ہٹاؤ اب۔"

"خبر دار۔۔۔ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے جو تم آنا چاہتی تو کیا بابو جی روک لیتے؟"

اندو نے بے بسی سے کہا، "ہائے جی۔۔۔ تم بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں

انہیں بھلا کیسے کہہ سکتی تھی؟ سچ پوچھو تو تم نے مجھے بلوا کر بابو جی پر تو بڑا جلم کیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں ان کا جی بہت لگا ہوا تھا بال بچوں میں۔"

"اور میرا جی؟"

"تمہارا جی؟" تم تو کہیں بھی لگا سکتے ہو۔ اندو نے شرارت سے کہا اور اس طرح سے مدن کی طرف دیکھا کہ اس کی مدافعت کی ساری قوتیں ختم ہو گئیں۔ یوں بھی اسے کسی اچھے سے بہانے کی تلاش تھی۔ اس نے اندو کو پکڑ کر سینے سے لگا لیا اور بولا، "بابو جی تم سے بہت خوش تھے؟"

"ہاں" اندو بولی، "ایک دن میں جاگی تو دیکھا سرہانے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اپنی قسم"!

"اپنی قسم نہیں۔۔۔ میری قسم کھاؤ۔"

"تمہاری قسم تو میں نہیں کھاتی۔۔۔ کوئی کچھ بھی دے۔"

"ہاں!" مدن نے سوچتے ہوئے کہا، "کتابوں میں اسے سیکس کہتے ہیں۔"

"سیکس؟" اندو نے پوچھا، "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہی جو مرد اور عورت کے بیچ ہوتا ہے۔"

"ہائے رام!" اندو نے ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا، "گندے کہیں کے شرم نہیں آئی بابو جی کے بارے میں ایسا سوچتے ہوئے؟"

"تو بابو جی کو نہ آئی تجھے دیکھتے ہوئے؟"

"کیوں؟" اندو نے بابو جی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا، "وہ اپنی بہو کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔"

"کیوں نہیں۔ جب بہو تم ایسی ہو۔"

"تمہارا من گندا ہے۔" اندو نے نفرت سے کہا، "اسی لئے تمہارا کاروبار بھی گندے بروزے کا ہے۔ تمہاری کتابیں سب گندگی سے بھری پڑی ہیں۔ تمہیں اور تمہاری کتابوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ایسے تو جب میں بڑی ہو گئی تھی تو میرے پتا جی نے مجھ سے ادھک پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو کیا وہ بھی۔۔۔ وہ تھا نگوڑا۔۔۔ جس کا تم ابھی نام لے رہے تھے۔" اور پھر اندو بولی، "بابو جی کو یہاں بلا لو۔ ان کا وہاں جرا بھی جی نہیں لگتا۔ وہ دکھی ہوں گے تو کیا تم دکھی نہیں ہو گے؟"

مدن اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا۔ گھر میں ماں کی موت نے بڑا ہونے کے کارن سب سے زیادہ اثر مدن پر ہی کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ ماں کے

بیمار رہنے کے باعث جب بھی اس کی موت کا خیال مدن کے دل میں آتا تو آنکھیں موند کر پرارتھنا شروع کر دیتا۔۔۔ اوم نمو بھگوتے واسودیوا۔ اوم نمو۔۔۔ اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی چھتر چھایا بھی سر سے اٹھ جائے۔ خاص طور پر ایسے میں جبکہ وہ اپنے کاروبار کو بھی جما نہیں پایا تھا۔ اس نے غیر یقینی لہجے میں اندو سے صرف اتنا کہا، ”ابھی رہنے دو بابو کو۔ شادی کے بعد ہم دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ مل سکتے ہیں۔“

تیسرے چوتھے روز بابو جی کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا خط آیا۔ میرے پیارے مدن کے تخاطب میں میرے پیارے کے الفاظ شور پانیوں میں دھل گئے تھے۔ لکھا تھا، ”بہو کے یہاں ہونے پر میرے تو وہی پرانے دن لوٹ آئے تھے، تمہاری ماں کے دن، جب ہماری نئی شادی ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی الہڑ تھی۔ ایسے میں اتارے ہوئے کپڑے ادھر ادھر پھینک دیتی اور پتا جی سمیٹتے پھرتے۔ وہی صندل کا صندوق، وہی بیسوں خلجگن۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ آ رہا ہوں۔ کچھ نہیں تو دہی بڑے یا ربڑی لا رہا ہوں۔ اب گھر میں کوئی نہیں۔ وہ جگہ جہاں صندل کا

صندوق پڑا تھا، خالی ہے" اور پھر ایک آدھ سطر اور ڈھل گئی تھی۔ آخر میں لکھا تھا" دفتر سے لوٹتے سمے، یہاں کے بڑے بڑے اندھے کمروں میں داخل ہوتے ہوئے میرے من میں ایک ہول سا اٹھتا ہے۔" اور پھر "بہو کا خیال رکھنا۔ اسے کسی ایسی ویسی دایہ کے حوالے مت کرنا۔"

اندو نے دونوں ہاتھوں سے چٹھی پکڑ لی۔ سانس کھینچ لی، آنکھیں پھیلاتی شرم سے پانی پانی ہوتی ہوئی بولی، "میں مر گئی۔ بابو جی کو کیسے پتہ چل گیا؟"

مدن نے چٹھی چھڑاتے ہوئے کہا، "بابو جی کیا کہتے ہیں؟ دنیا دیکھی ہے۔ ہمیں پیدا کیا ہے۔"

"ہاں مگر" اندو بولی "ابھی دن ہی کے ہوئے ہیں۔" اور پھر اس نے ایک تیز سی نظر اپنے پیٹ پر ڈالی جس نے ابھی بڑھنا بھی شروع نہیں کیا تھا اور جیسے بابو جی یا کوئی اور دیکھ رہا ہو۔ اس نے ساری کا پلو اس پر کھینچ لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ جبھی ایک چمک سی اس کے چہرے پر آئی اور وہ بولی۔ "تمہاری سسرال سے شیرینی

آئے گی۔"

"میری سسرال۔۔۔؟ او ہاں۔" مدن نے راستہ پاتے ہوئے کہا، "کتنی شرم کی بات ہے۔ ابھی چھ آٹھ مہینے شادی کے ہوئے ہیں اور چلا آ رہا ہے۔" اور اس نے اندو کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

مدن کی ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی تھیں۔ اس وقت خوف سے نہیں تسلی سے۔

"چلا آیا ہے یا تم لائے ہو؟"

"تم۔۔۔ یہ سب قصور تمہارا ہے۔ کچھ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"تمہیں پسند نہیں؟"

"ایک دم نہیں۔"

"کیوں؟"

"چار دن تو مزے لے لیتی زندگی کے۔"

"کیا یہ جندگی کا مجا نہیں؟" اندو نے صدمہ زدہ لہجے میں کہا، "مرد عورت شادی کس لئے کرتے ہیں؟ بھگوان نے بن مانگے دے دیا نا؟ پوچھو ان سے جن کے نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کچھ کرتی ہیں۔ پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں۔ سمادھیوں، مجاوروں پر چوٹیاں باندھتی ہیں، شرم وحیا تج کر دریاؤں کے کنارے ننگی ہو کر سرکنڈے کاٹتی، شمسانوں میں مسان جگاتی۔"

"اچھا! اچھا!" مدن بولا، "تم نے بکھان ہی شروع کر دیا۔ اولاد کے لئے تھوڑی عمر پڑی تھی؟"

"ہو گا تو!" اندو نے سرزنش کے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا، "جاؤ تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ وہ تمہارا نہیں، میرا ہو گا۔ تمہیں تو اس کی جرورت نہیں، پر اس کے دادا کو بہت ہے۔ یہ میں جانتی ہوں۔" اور پھر کچھ خجل، کچھ صدمہ زدہ ہو کر اندو نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ وہ سوچتی تھی پیٹ میں اس ننھی سی جان کو پالنے کے سلسلے میں، اس جان کا ہوتا سوتا تھوڑی بہت ہمدردی تو کرے گا ہی لیکن مدن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک لفظ بھی اس نے منہ سے نہ نکالا۔ اندو نے

چہرے پر سے ہاتھ اٹھا کر بدن کی طرف دیکھا اور ہونے والی پہلوٹن کے خاص انداز میں بولی، ”وہ تو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب پیچھے ہو گا۔ پہلے تو میں بچوں گی ہی نہیں مجھے بچپن سے وہم ہے اس بات کا۔“

مدن بھی جیسے خائف ہو گیا۔ یہ خوبصورت ’چیز‘ جو حاملہ ہو جانے کے بعد اور بھی خوبصورت ہو گئی ہے، مر جائے گی؟ اس نے پیٹھ کی طرف سے اندو کو تھام لیا اور پھر کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا اور بولا، ”تجھے کچھ نہ ہو گا اندو میں تو موت کے منہ سے بھی چھین کر لے آؤں گا تجھے۔ اب ساوتری کی نہیں، ستیہ وان کی باری ہے۔“

مدن سے لپٹ کر اندو بھول ہی گئی کہ اس کا اپنا بھی کوئی دکھ ہے۔

اس کے بعد بابو جی نے کچھ نہ لکھا۔ البتہ سہارنپور سے ایک سارٹر آیا جس نے صرف اتنا بتایا کہ بابو جی کو پھر سے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ایک دورے میں تو وہ قریب قریب چل ہی بسے تھے۔ مدن ڈر گیا۔ اندو رونے لگی۔ سارٹر کے چلے

جانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مدن نے آنکھیں موند لیں اور من ہی من میں پڑھنے لگا۔۔۔اوم نمو بھگوتے۔۔۔

دوسرے روز ہی مدن نے باپ کو چٹھی لکھی۔۔۔ "بابو جی! چلے آؤ۔۔۔بچے بہت یاد کرتے ہیں اور آپ کی بہو بھی۔۔۔"لیکن آخر نوکری تھی۔ اپنے بس کی بات تھوڑی تھی۔ دھنی رام کے خط کے مطابق وہ چھٹی کا بندوبست کر رہے تھے ان کے بارے میں دن بہ دن مدن کا احساس جرم بڑھنے لگا۔ "اگر میں اندو کو وہیں رہنے دیتا تو میرا کیا بگڑ جاتا؟"

وجے دشمی سے ایک رات پہلے مدن اضطراب کے عالم میں بیچ والے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا کہ اندر سے رونے کی آواز آئی اور وہ چونک کر دروازے کی طرف لپکا۔ بیگم دایہ باہر آئی اور بولی، "مبارک ہو، مبارک ہو بابو جی لڑکا ہوا ہے۔"

"لڑکا؟" مدن نے کہا اور پھر متفکّرانہ لہجے میں بولا، "بی بی کیسی ہے؟"

بیگم بولی، ’’خیر مہر ہے میں نے ابھی تک اسے لڑکی ہی بتائی ہے۔ زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو اس کی آنول نہیں گرتی نا۔‘‘

’’او۔۔۔‘‘ مدن نے بیو قوفوں کی طرح آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا اور کمرے میں جانے کے لئے آگے بڑھا۔ بیگم نے اسے وہیں روک دیا اور کہنے لگی، تمہارا اندر کیا کام؟ اور پھر ایکا ایکی دروازہ بھیڑ کر اندر لپک گئی یا شاید اس لئے کہ جب کوئی اس دنیا میں آتا ہے تو ارد گرد کے لوگوں کی یہی حالت ہوتی ہے۔ مدن نے سن رکھا تھا جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو گھر کے در و دیوار لرزنے لگتے ہیں۔ گویا ڈر رہے ہیں کہ بڑا ہو کر ہمیں بیچے گا یا رکھے گا۔ مدن نے محسوس کیا کہ جیسے سچ مچ ہی دیواریں کانپ رہی تھیں زچگی کے لئے چکلی بھابی تو نہ آئی تھیں کیونکہ اس کا اپنا بچہ تو بہت چھوٹا تھا البتہ دریا آباد والی پھوپھی ضرور پہنچی تھیں جس نے پیدائش کے وقت رام، رام، رام، رام کی رٹ لگا دی تھی اور اب وہی رٹ مدھم ہو رہی تھی۔

زندگی بھر مدن کو اپنا آپ اس قدر فضول اور بیکار نہ لگا تھا۔ اتنے میں پھر دروازہ کھلا اور پھوپھی نکلی۔ بر آمدے کی بجلی کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بھوت کے

چہرے کی طرح ایک دم دودھیا نظر آرہا تھا۔ مدن نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا، ”اندو ٹھیک ہے نا پھوپھی۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے ٹھیک ہے!“ پھوپھی نے تین چار بار کہا اور پھر اپنا لرزتا ہوا ہاتھ مدن کے سر پر رکھ کر اسے نیچا کیا، چوما اور باہر لپک گئی۔

پھوپھی برآمدے کے دروازے میں سے باہر جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ بیٹھک میں پہنچی جہاں باقی بچے سو رہے تھے۔ پھوپھی نے ایک ایک کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر چھت کی طرف آنکھیں اٹھا کر منہ میں کچھ بولی اور پھر نڈھال سی ہو کر منی کے پاس لیٹ گئی۔

اوندھی۔۔۔ اس کے پھڑکتے ہوئے شانوں سے پتہ چل رہا تھا جیسے رو رہی ہے۔ مدن حیران ہوا۔۔۔ پھوپھی تو کئی زچگیوں سے گزر چکی ہے، پھر کیوں اس کی روح کانپ اٹھی ہے۔

پھر ادھر کے کمرے سے ہرمل کی بو باہر لپکی۔ دھوئیں کا ایک غبار سا آیا۔ جس

نے مدن کا احاطہ کر لیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ جبھی بیگم دایہ کپڑے میں کچھ لپیٹے ہوئے باہر نکلی۔ کپڑے پر خون ہی خون تھا۔ جس میں کچھ قطرے نکل کر فرش پر گر گئے۔ مدن کے ہوش اڑ گئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بیچ میں اندو کی ایک نر گھلی سی آواز آئی۔ "ہائے ہائے" اور پھر بچے کے رونے کی آواز۔

تین چار دن میں بہت کچھ ہوا۔ مدن نے گھر کے ایک طرف گڑھا کھود کر آنول کو دبا دیا۔ کتوں کو اندر آنے سے روکا لیکن اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ہرمل کی بو دماغ میں بس جانے کے بعد آج ہی اسے ہوش آیا ہے، کمرے میں وہ اکیلا ہی تھا اور اندو۔۔۔ نند اور جسودھا۔۔۔ اور دوسری طرف نند لال۔۔۔ اندو نے بچے کی طرف دیکھا اور کچھ ٹوہ لینے کے سے انداز میں بولی، "بالکل تم ہی پر گیا ہے۔"

"ہو گا۔" مدن نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر بچے پر ڈالتے ہوئے کہا، "میں تو کہتا ہوں شکر ہے بھگوان کا کہ تم بچ گئیں۔"

"ہاں!" اندو بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی۔۔۔"

"شبھ شبھ بولو۔" مدن نے ایک دم اندو کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو جو کچھ ہوا ہے میں تو اب تمہارے پاس بھی نہیں پھٹکوں گا۔" اور مدن نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"توبہ کرو۔" اندو بولی۔

مدن نے اسی دم کان اپنے ہاتھ سے پکڑ لئے اور اندو نحیف آواز میں ہنسنے لگی۔

بچہ ہونے کے کئی روز تک اندو کی ناف ٹھکانے پر نہ آئی۔ وہ گھوم گھوم کر اس بچے کی تلاش کر رہی تھی جو اب اس سے پرے، باہر کی دنیا میں جا کر اپنی اصلی ماں کو بھول گیا تھا۔ اب سب کچھ ٹھیک تھا اور اندو شانتی سے اس دنیا کو تک رہی تھی معلوم ہوتا تھا اس نے مدن ہی کے نہیں دنیا بھر کے گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیے ہیں اور دیوی بن کر دیا اور کرونا کے پرساد بانٹ رہی ہے۔۔۔ مدن نے اندو کے منہ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا۔ اس سارے خون خرابے کے بعد کچھ

دبلی ہو کر اندو اور بھی اچھی لگنے لگی ہے۔۔۔ جبھی ایکا ایکی اندو نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لئے۔

"کیا ہوا؟" مدن نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اندو تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کر کے بولی۔ "اسے بھوک لگی ہے" اور اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے۔۔۔؟ بھوک۔۔۔؟" مدن نے پہلے بچے کی طرف اور پھر اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"دیکھتے نہیں" اندو نیچے کی طرف نگاہ کرتے ہوئے بولی، "سب کچھ گیلا ہو گیا ہے۔"

مدن نے غور سے ڈھیلے ڈھالے گلے کی طرف دیکھا۔ جھر جھر دودھ بہہ رہا تھا اور ایک خاص قسم کی بُو آرہی تھی۔ پھر اندو نے بچے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، "اسے مجھے دے دو"!

مدن نے ہاتھ پنگھوڑے کی طرف بڑھایا اور اسی دم کھینچ لیا۔ پھر کچھ ہمّت سے کام لیتے ہوئے اس نے بچے کو یوں اٹھایا جیسے وہ کوئی مرا ہوا چوہا ہے۔ آخر اس نے بچے کو اندو کی گود میں دے دیا۔ اندو مدن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، ''تم جاؤ باہر۔''

کیوں؟ باہر کیوں جاؤں؟ مدن نے پوچھا۔

''جاؤ نا۔۔۔'' اندو نے کچھ مچلتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا، ''تمہارے سامنے میں دودھ نہیں پلا سکوں گی۔''

''ارے؟'' مدن حیرت سے بولا، ''میرے سامنے نہیں پلا سکے گی؟'' اور پھر نا سمجھی کے انداز میں سر کو جھٹکا دے کر باہر کی طرف چل نکلا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے مڑتے ہوئے اندو پر ایک نگاہ ڈالی۔ اتنی خوبصورت اندو آج تک نہیں لگی تھی۔

بابو دھنی رام چھٹی پر گھر لوٹے تو وہ پہلے سے آدھے دکھائی پڑتے تھے۔ جب اندو

نے پوتا ان کی گود میں دیا تو وہ کھل اٹھے۔ ان کے پیٹ کے اندر کوئی پھوڑا نکل آیا تھا جو چوبیس گھنٹے انہیں سولی پر لٹکائے رکھتا۔ اگر منا روتا تو بابو جی کی اس سے دس گنا بری حالت ہوتی۔

کئی علاج کئے گئے۔ بابو جی کے آخری علاج میں ڈاکٹر نے ادھنی کے برابر پندرہ بیس گولیاں روز کھانے کو دیں۔ پہلے ہی دن انہیں اتنا پسینہ آیا کہ دن میں تین تین چار چار بار کپڑے بدلنے پڑے۔ ہر بار مدن کپڑے اتار کر بالٹی میں نچوڑتا۔ صرف پسینے سے ہی بالٹی ایک چوتھائی ہو گئی تھی۔ رات انہیں متلی سی محسوس ہونے لگی تھی اور انہوں نے پکارا "بہو ذرا داتن تو دینا ذائقہ بہت خراب ہو رہا ہے۔" بہو بھاگی ہوئی گئی اور داتن لے کر آئی۔ بابو جی اٹھ کر داتن چبا ہی رہے تھے کہ ایک اُبکائی آئی۔ ساتھ ہی خون کا پرنالا لے آئی۔ بیٹے نے واپس سرہانے کی طرف لٹایا تو ان کی پتلیاں پھر چکی تھیں اور کوئی ہی دم میں وہ اوپر آسمان کے گلزار میں پہنچ چکے تھے جہاں انہوں نے اپنا پھول پہچان لیا تھا۔۔۔

منے کو پیدا ہوئے کُل بیس پچیس روز ہوئے تھے۔ اندو نے منہ نوچ کر، سر اور

چھاتی پیٹ پیٹ کر خود کو نیلا کر لیا۔ مدن کے سامنے وہی منظر تھا جو اس نے تصور میں اپنے مرنے پر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اندو نے چوڑیاں توڑنے کی بجائے اتار کر رکھ دی تھیں۔ سر پر راکھ نہیں ڈالی تھی لیکن زمین پر سے مٹی لگ جانے اور بالوں کے بکھر جانے سے چہرہ بھیانک ہو گیا تھا۔ ''لوگو! میں لٹ گئی۔'' کی جگہ اس نے ایک دل دوز آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا، ''لوگو! ہم لٹ گئے''!

گھر بار کا کتنا بوجھ مدن پر آ پڑا تھا۔ اس کا ابھی مدن کو پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ صبح ہونے تک اس کا دل لپک کر منہ میں آ گیا۔ وہ شاید بچ نہ پاتا۔ اگر وہ گھر کے باہر بدرو کے کنارے سیل چڑھی مٹی پر اوندھا لیٹ کر اپنے دل کو ٹھکانے پر نہ لاتا۔۔۔ دھرتی ماں نے چھاتی سے لگا کر اپنے بچے کو بچا لیا تھا۔ چھوٹے بچے کندن، دلاری منی، پاشی یوں چلا رہے تھے جیسے گھونسلے پر شکرے کے حملے پر چڑیا کے بونٹ چونچیں اٹھا اٹھا کر چیں چیں کرتے ہیں۔ انہیں اگر کوئی پروں کے اندر سمیٹتی ہے تو اندو۔۔۔

نالی کے کنارے پڑے پڑے مدن نے سوچا اب تو یہ دنیا میرے لئے ختم ہو گئی

ہے۔ کیا میں جی سکوں گا؟ زندگی میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟ وہ اٹھا اور اٹھ کر گھر کے اندر چلا آیا۔

سیڑھیوں کے نیچے غسل خانہ تھا جس میں گھس کر اندر سے کواڑ بند کرتے ہوئے مدن نے ایک بار پھر اس سوال کو دہرایا، "میں کبھی ہنس بھی سکوں گا؟" اور وہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ حالانکہ اس کے باپ کی لاش ابھی پاس ہی بیٹھک میں پڑی تھی۔

باپ کو آگ میں حوالے کرنے سے پہلے مدن ارتھی پر پڑے ہوئے جسم کے سامنے ڈنڈوت کے انداز میں لیٹ گیا۔ یہ اس کا اپنے جنم داتا کو آخری پرنام تھا۔ تس پر بھی وہ رو نہ رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ماتم میں شریک ہونے والے رشتہ دار محلہ سن، سے رہ گئے۔ پھر ہندو رواج کے مطابق سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے مدن کو چتا جلانی پڑی۔ جلتی ہوئی کھوپڑی میں کپال کرپا کی لاٹھی مارنی پڑی۔۔۔ عورتیں باہر ہی سے شمشان کے کنویں پر سے نہا کر لوٹ چکی تھیں۔ جب مدن گھر پہنچا تو وہ کانپ رہا تھا۔ دھرتی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے جو

طاقت اپنے بیٹے کو دی تھی، رات گھر کے گھر آنے پر پھر سے ہول میں ڈھل گئی۔۔۔ اسے کوئی سہارا چاہیئے تھا، کسی ایسے جذبے کا سہارا جو موت سے بھی بڑا ہو۔ اس وقت دھرتی ماں کی بیٹی جنک دلاری اندو نے کسی گھڑے میں سے پیدا ہو کر اس رام کو اپنی بانہوں میں لے لیا اس رات کو اگر اندو اپنا آپ یوں اس پر نثار نہ کرتی تو اتنا بڑا دکھ مدن کو لے ڈوبتا۔

دس ہی مہینے کے اندر اندر ان کا دوسرا بچہ چلا آیا۔ بیوی کو اس دوزخ کی آگ میں دھکیل کر خود اپنا دکھ بھول گیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا اگر میں شادی کے بعد بابو جی کے پاس گئی ہوئی تو اندو کو نہ بلا لیتا تو شاید وہ اتنی جلدی نہ چل دیتے۔ لیکن پھر وہ باپ کی موت سے پیدا ہونے والے خسارے کو پورا کرنے میں لگ جاتا۔۔۔ کاروبار جو پہلے بے توجہی کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔۔۔ مجبوراً چل نکلا۔۔۔ ان دنوں بڑے بچے کو مدن کے پاس چھوڑ کر، چھوٹے کو چھاتی سے گلے لگائے اندو میکے چلی گئی۔ پیچھے منا طرح طرح کی ضد کرتا تھا جو کبھی مانی جاتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔ میکے سے اندو کا خط آیا۔۔۔ مجھے یہاں اپنے بیٹے کے رونے کی آواز آ

رہی ہے، اسے کوئی مارتا تو نہیں۔۔۔؟ مدن کو بڑی حیرت ہوئی۔۔۔ ایک جاہل ان پڑھ عورت ایسی باتیں کیسے لکھ سکتی ہے۔۔۔؟ پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔۔۔ کیا یہ بھی کوئی رٹا ہوا فقرہ ہے؟

سال گزر گئے۔ پیسے کبھی اتنے نہ آئے کہ ان سے کچھ عیش ہو سکے لیکن گزارے کے مطابق آمدنی ضرور ہو جاتی تھی۔ دقت اس وقت پر ہوتی جب کوئی بڑا اخرچ سامنے آ جاتا۔ کندن کا داخلہ دینا ہے، دلاری منی کا شگن بھجوانا ہے۔ اس وقت مدن منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا اور پھر اندو ایک طرف سے آتی مُسکراتی ہوئی اور کہتی، ”کیوں دکھی ہو رہے ہو؟“ مدن امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا، ”دکھی نہ ہوں؟ کندن کا بی اے کا داخلہ دینا ہے منی“ اندو پھر ہنستی اور کہتی۔ ”چلو میرے ساتھ“ اور مدن بھیڑ کے بچے کی طرح اندو کے پیچھے چل دیتا۔ اندو صندل کے صندوق کے پاس پہنچتی جسے کسی کو، مدن سمیت ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بات پر خفا ہو کر مدن کہتا، ”مرو گی تو اسے بھی چھاتی پر ڈال کے لے جانا۔“ اور اندو کہتی، ”ہاں! لے جاؤں گی۔“ پھر اندو وہاں

سے مطلوبہ رقم نکال کر سامنے رکھ دیتی۔

"یہ کہاں سے آ گئے؟"

"کہیں سے بھی آئے۔ تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے۔"

"پھر بھی؟"

"تم جاؤ اپنا کام چلاؤ۔"

اور جب مدن زیادہ اصرار کرتا تو اندو کہتی، "میں نے ایک سیٹھ دوست بنایا ہے نا۔" اور پھر ہنسنے لگتی۔

جھوٹ جانتے ہوئے بھی مدن کو یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ پھر اندو کہتی، "میں پورا لٹیرا ہوں تم نہیں جانتے؟ سخی اور لٹیرا۔ جو ایک ہاتھ سے لوٹتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے گریب گربا کو دے دیتا ہے۔" اس طرح منی کی شادی ہوئی جس پر ایسی ہی لوٹ کے زیور بکے۔ قرضہ چڑھا اور پھر اتر بھی گیا۔ ایسے ہی کندن بھی بیاہا گیا۔

ان شادیوں میں اندو ہی ”ہتھ بھرا“ کرتی تھی اور ماں کی جگہ کھڑی ہو جاتی۔ آسمان سے بابو جی اور ماں دیکھا کرتے اور پھول برساتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ پھر ایسا ہوا، اوپر ماں اور بابو جی میں جھگڑا اچل گیا۔ ماں نے بابو جی سے کہا، ”تم تو بہو کے ہاتھ کی پکی کھا کر آئے ہو۔ اس کا سکھ بھی دیکھا ہے۔ پر میں نصیبوں جلی نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔“ اور یہ جھگڑا وشنو، مہیش اور شیو تک پہنچا۔ انہوں نے ماں کے حق میں فیصلہ دے دیا اور یوں ماں، مات لوک میں آ کر بہو کی کوکھ میں پڑی اور اندو کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

پھر اندو ایسی دیوی بھی نہ تھی۔ جب کوئی اصول کی بات ہوتی تو نند دیور کیا خود مدن سے بھی لڑ پڑتی۔ مدن راست بازی کی اس پتلی کو خفا ہو کر ہریش چندر کی بیٹی کہا کرتا تھا۔ چونکہ اندو کی باتوں میں الجھاؤ ہونے کے باوجود سچائی اور دھرم قائم رہتے تھے، اس لئے مدن اور کنبے کے باقی سب لوگوں کی آنکھیں اندو کے سامنے نیچے رہتی تھیں۔ جھگڑا کتنا بھی بڑھ جائے۔ مدن اپنے شوہری زعم میں کتنا بھی اندو کی بات کو رد کر دے لیکن آخر سب ہی سر جھکائے ہوئے اندو ہی کی

شرن میں آتے تھے اور اسی سے شما نگتے تھے۔

نئی بھابھی آئی۔ کہنے کو تو وہ بھی بیوی تھی لیکن اندو ایک عورت تھی، جسے بیوی کہتے ہیں۔ اس کے الٹ چھوٹی بھابھی رانی ایک بیوی تھی جسے عورت کہتے ہیں۔ رانی کے کارن بھائیوں میں جھگڑا ہوا اور جے پی چاچا کی معرفت جائیداد تقسیم ہوئیں جس میں ماں باپ کو جائیداد تو ایک طرف اندو کی اپنی بنائی ہوئی چیزیں بھی تقسیم کی زد میں آ گئیں اور اندو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ جہاں سب کچھ ہو جانے کے بعد اور الگ ہو کر بھی کندن اور رانی ٹھیک سے نہیں بس سکے تھے، وہاں اندو کا نیا گھر دنوں ہی میں جگ مگ جگ مگ کرنے لگا تھا۔

بچی کی پیدائش کے بعد اندو کی صحت وہ نہ رہی۔ بچی ہر وقت اندو کی چھاتیوں سے چمٹی رہتی جہاں سبھی گوشت کے اس لوتھڑے پر تھو تھو کرتے تھے وہاں ایک اندو تھی جو اسے کلیجے سے لگائے پھرتی لیکن کبھی خود پریشان ہو اٹھتی اور بچی کو سامنے جھلنگے میں پھینکتے ہوئے کہہ اٹھتی، ”تو مجھے بھی جینے دے گی۔ ماں؟“ اور بچی چلا چلا کر رونے لگتی۔

مدن اندو سے کٹنے لگا۔ شادی سے لے کر اس وقت تک اسے وہ عورت نہ ملی تھی جس کا وہ متلاشی تھا۔ گندہ بیروزہ بکنے لگا اور مدن نے بہت سارو پیہ اندو سے بالا بالا خرچ کرنا شروع کر دیا۔ بابو جی کے چلے جانے کے بعد کوئی پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔ پوری آزادی تھی۔

گویا پڑوسی سبطے کی بھینس پھر مدن کے منہ کے پاس پھنکارنے لگی۔ بلکہ بار بار پھنکارنے لگی۔ شادی کی رات والی بھینس تو بک چکی تھی لیکن اس کا مالک زندہ تھا۔ مدن اس کے ساتھ ایسی جگہوں پر جانے لگا جہاں روشنی اور سائے عجیب بے قاعدہ سی شکلیں بناتے ہیں۔ نکّڑ پر بھی کبھی اندھیرے کی تکون بنتی ہے اور اوپر کھٹ سے روشنی کی ایک چوکور لہر آکر اسے کاٹ دیتی ہے۔ کوئی تصویر پوری نہیں بنتی۔ معلوم ہوتا ہے بغل سے ایک پاجامہ نکلا اور آسمان کی طرف اڑ گیا۔ یا کسی کوٹ نے دیکھنے والا کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ لیا اور کوئی سانس کے لئے تڑپنے لگا۔ جبھی روشنی کی ایک چوکور لہر ایک چوکٹھا بن گئی اور اس میں ایک صورت آکر کھڑی ہو گئی۔ دیکھنے والے نے ہاتھ بڑھایا تو وہ آرپار چلا گیا۔ جیسے وہاں

کچھ بھی نہ تھا۔ پیچھے کوئی کتارونے لگا۔ اوپر طبل نے اس کی آواز ڈبو دی۔

مدن کو اس کے تصور کے خد و خال ملے لیکن ہر جگہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آرٹسٹ سے ایک خط غلط لگ گیا یا ہنسی کی آواز ضرورت سے زیادہ بلند تھی اور مدن داغ صنّاعی اور متوازن ہنسی کی تلاش میں کھو گیا۔

سبطے نے اس وقت اپنی بیوی سے بات کی جب اس کی بیگم نے مدن کو مثالی شوہر کی حیثیت سے سبطے کے سامنے پیش کیا۔ پیش ہی نہیں کیا بلکہ منہ پہ مارا۔ اس کو اٹھا کر سبطے نے بیگم کے منہ پر دے مارا۔ معلوم ہوتا تھا کسی خونین تربوز کا گودا ہے جس کے رگ و ریشے بیگم کی ناک اس کی آنکھوں اور کانوں پر لگے ہوئے ہیں۔ کروڑ کروڑ گالی بکتی ہوئی بیگم نے حافظے کی ٹوکری میں سے گودا اور بیج اٹھائے اور اندو کے صاف سُتھرے صحن میں بکھیر دیئے۔

ایک اندو کی بجائے دو اندو ہو گئیں۔ ایک تو اندو خود تھی اور دوسری ایک کانپتا ہوا خط جو اندو کے پورے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھا اور جو نظر نہیں آ رہا تھا۔

مدن کہیں بھی جاتا تھا تو گھر سے ہو کر۔ نہا دھو، اچھے کپڑے پہن، مگھی کی ایک گلوری جس میں خوشبودار قوام لگا ہو، منہ میں رکھ کر لیکن۔ اس دن مدن گھر آیا تو اندو کی شکل ہی دوسری تھی۔ اس نے چہرے پر پوڈر تھوپ رکھا تھا۔ گالوں پر روج لگا رکھی تھی۔ لپ اسٹک نہ ہونے پر ہونٹ ماتھے کی بندی سے رنگ لئے تھے اور بال کچھ اس طریقے سے بنائے تھے کہ مدن کی نظریں ان میں الجھ کر رہ گئیں، "کیا بات ہے آج؟" مدن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں" اندو نے مدن سے نظریں بچاتے ہوئے کہا، "آج فرصت ملی ہے۔"

شادی کے پندرہ بیس برس گزر جانے کے بعد اندو کو آج فرصت ملی تھی اور وہ بھی اس وقت جب چہرے پر جھائیاں آ چلی تھیں۔ ناک پر ایک سیاہ کاٹھی بن گئی تھی اور بلاؤز کے نیچے ننگے پیٹ کے پاس کمر پر چربی کی دو تہیں سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ آج اندو نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان عیوب میں سے ایک بھی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں بنی ٹھنی۔ کسی کسائی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ "یہ نہیں ہو سکتا" مدن نے سوچا اور اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے پھر ایک بار مڑ کر اندو کی

طرف دیکھا جیسے گھوڑوں کے بیوپاری کسی نامی گھوڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہاں گھوڑی بھی تھی اور لال لگام بھی۔ یہاں جو غلط خط لگے تھے، شرابی آنکھوں کو نہ دکھ سکے۔ اندو سچ مچ خوبصورت تھی۔ آج بھی پندرہ سال کے بعد پھولاں، رشیدہ، مسز رابرٹ اور ان کی بہنیں ان کے سامنے پانی بھرتی تھیں۔ پھر مدن کو رحم آنے لگا اور ایک ڈر۔۔۔

آسمان پر کوئی خاص بادل بھی نہ تھے لیکن پانی پڑنا شروع ہو گیا۔ ادھر گھر کی گنگا طغیانی پر تھی اور اس کا پانی کناروں سے نکل نکل کر پوری ترائی اور اس کے آس پاس بسنے والے گاؤں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی رفتار سے اگر پانی بہتا رہا تو اس میں کیلاش پربت بھی ڈوب جائے گا۔ ادھر بچی رونے لگی۔ ایسا رونا جو وہ آج تک نہ روئی تھی۔ مدن نے اس کی آواز سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ کھولیں تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ جوان عورت بن کر۔ نہیں نہیں، وہ اندو تھی، اپنی ماں کی بیٹی، اپنی بیٹی کی ماں۔ جو اپنی آنکھوں کے دنبالے سے مُسکرائی اور ہونٹوں کے کونے سے دیکھنے لگی۔

اسی کمرے میں جہاں ایک دن ہرمل کی دھونی نے مدن کو چکرا دیا تھا، آج اس کی خوشبو نے بوکھلا دیا تھا۔ ہلکی بارش تیز بارش سے خطرناک ہوتی ہے۔ اس لئے باہر کا پانی اوپر کسی کڑی میں سے رستا ہوا اندو اور مدن کے بیچ ٹپکنے لگا۔ لیکن مدن تو شرابی ہو رہا تھا۔ اس نشے میں اس کی آنکھیں سمٹنے لگیں اور تنفّس تیز ہو کر انسان کا تنفّس نہ رہا۔

''اندو۔۔۔'' مدن نے کہا اور اس کی آواز شادی کی رات والی پکار سے دو سر اوپر تھی اور اندو نے پرے دیکھتے ہوئے کہا، ''جی'' اور اس کی آواز دو سر نیچے تھی۔ پھر آج چاندنی کی بجائے اماوس تھی۔ اس سے پہلے کہ مدن اندو کی طرف ہاتھ بڑھاتا۔ اندو خود ہی مدن سے لپٹ گئی۔ پھر مدن نے ہاتھ سے اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور دیکھنے لگا۔ اس نے کیا کھویا، کیا پایا ہے؟ اندو نے ایک نظر مدن کے سیاہ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف پھینکی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ''یہ کیا؟'' مدن نے چونکتے ہوئے کہا، ''تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔''

''یوں ہی'' اندو نے کہا اور بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی، ''رات بھر جگایا

ہے اس چڑیل میّا نے۔“

بچی اب تک خاموش ہو چکی تھی۔ گویا وہ دم سادھے دیکھ رہی تھی۔ اب کیا ہونے والا ہے؟ آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا؟ واقعی آسمان سے پانی پڑنا بند ہو گیا تھا۔ مدن نے پھر غور سے اندو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”ہاں مگر یہ آنسو؟“

”خوشی کے ہیں“ اندو نے جواب دیا، ”آج کی رات میری ہے“ اور پھر ایک عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ مدن سے چمٹ گئی۔ ایک تلذّذ کے احساس سے مدن نے کہا، ”آج برسوں کے بعد میرے من کی مراد پوری ہوئی اندو! میں نے ہمیشہ چاہا تھا۔۔۔“

”لیکن تم نے کہا نہیں،“ اندو بولی، ”یاد ہے شادی والی رات میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟“

”ہاں!“ مدن بولا، ”اپنے دکھ مجھے دے دو۔“

”تم نے کچھ نہیں مانگا مجھ سے۔“

”میں نے؟“ مدن نے حیران ہوتے ہوئے کہا، ”میں کیا مانگتا؟ میں تو جو کچھ مانگ سکتا تھا وہ سب تم نے دے دیا۔ میرے عزیزوں سے پیار۔۔۔ ان کی تعلیم، بیاہ شادیاں۔۔۔ یہ پیارے پیارے بچے۔۔۔ یہ سب کچھ تو تم نے دے دیا۔“

”میں بھی یہی سمجھتی تھی۔“ اندو بولی، ”لیکن اب جا کر پتہ چلا، ایسا نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“ پھر اندو نے رک کر کہا، ”میں نے بھی ایک چیز رکھ لی۔“

”کیا چیز رکھ لی؟“

اندو کچھ دیر چپ رہی اور پھر اپنا منہ پرے کرتے ہوئے بولی، ”اپنی لاج۔۔۔ اپنی خوشی۔۔۔ اس وقت تم بھی کہہ دیتے، اپنے سکھ مجھے دے دو۔۔۔ تو میں۔۔۔“

اور اندو کا گلا رندھ گیا۔

اور کچھ دیر بعد بولی، ''اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔''

مدن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ زمین میں گڑ گیا۔ یہ ان پڑھ عورت؟ کوئی رٹا ہوا فقرہ؟ نہیں تو۔۔۔ یہ تو ابھی ہی زندگی کی بھٹی سے نکلا ہے۔ ابھی تو اس پر برابر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں اور آتشیں برادہ چاروں طرف اڑ رہا ہے۔

کچھ دیر بعد مدن کے ہوش ٹھکانے آئے اور بولا، ''میں سمجھ گیا اندو'' پھر روتے ہوئے مدن اور اندو ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایسی دنیاؤں میں لے گئی جہاں انسان مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔

ٹرمینس سے پرے

پنجاب میل چلی تو خاصی سست رفتاری سے پلیٹ فارم کے احاطے سے باہر نکلی۔ دیر تک موہن جام کو اپنی نازک سی بیوی سومترا کا بدن، ایک سادہ سی ہینڈلوم کی ساڑی میں لپٹا ہوا نظر آتا رہا۔ سومترا کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑی تھی، جب کہ موہن ایک اسٹال کے برابر کھڑا آخر دم تک اپنا رومال ہلاتا رہا۔

گاڑی چلنے سے پہلے سومترا کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ الفاظ ہمیشہ کی طرح بیکار ہو گئے تھے۔۔۔ ”پیچھے گھر کا خیال رکھنا۔ ہوٹل کی روٹی مت کھانا۔ ہفتے میں ایک

نہیں، دو بار خط ضرور لکھنا۔" یہ سب باتیں آنکھوں کی زبان کے سامنے گونگی ہو گئی تھیں۔ اور انہوں نے موہن جام ایسے آدمی کے دل کو بھی گداز کر دیا تھا۔۔۔ ہر بیوی الگ ہونے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی تائید مانگتی ہے۔ اس وقت تو کوئی جھُوٹ بھی بول دے۔ لیکن کچھ لوگ۔۔۔ موہن نے کچھ نہ کہا۔ وہ پہلے تیز تیز اور پھر آہستہ آہستہ رومال ہلاتا رہا۔ یہ حرکت ایک رسم بن چُکی تھی، لیکن اچھی معلوم ہوتی تھی۔ دل کہاں، کیوں اور کس کے لیے دھڑک رہا ہے، یہ تو دکھائی نہیں دیتا، البتّہ رومال نظروں کے دُھندلکے میں حل ہونے تک برابر اس آدمی کو دکھائی دیتا ہے، جو۔۔۔ جا رہا ہے!

یہ سفر ہی بکواس۔ میں تو جب بھی کہیں جانے لگتا ہوں، میری طبیعت گر سی جاتی ہے۔ اسٹیشن پہ ہجوم، محض ہجوم کی وجہ سے آدمی تنہا رہ جاتا ہے۔ پھر آگے جانے کے لیے گاڑی تھوڑا پیچھے ہٹتی ہے۔ پھر کوئی سیٹی، کوئی آواز۔۔۔ "ارے ارے، گاڑی چھُوٹ گئی، میرا سامان رہ گیا۔۔۔" آخر۔۔۔ کوئی کسی کا نہیں۔ یہ دنیا۔۔۔ جب ایک بار تو جی چاہتا ہے، آدمی ٹکٹ وکٹ لَوٹا دے اور گھر جا کر

مزے سے بیٹھ جائے۔ چاہے بیوی سے لڑے ہی۔

زندگی کی فتح مندی یہی ہے کہ اُداسی کے سائے میں بھی کہیں خوشی کے جذبے رینگتے رہیں اور گاڑی کے چھوٹتے ہی لپک کر سامنے آجائیں اور ان کی روشنی میں اُداسیاں غائب ہو جائیں۔ کبھی جس کے ساتھ پروگرام بنتے تھے، اب اس کے بغیر بننے لگیں۔۔۔ موہن نے ایک گہرا سانس لیا۔۔۔ چلو، دو مہینے کی گئے چھُٹّی۔ کچھ چیزوں کا نہ ہونا ہی ایک طرح کا ہونا ہے۔ سومترا لوٹے گی، تو ایک بار اسے بھی پتہ چل چکا ہو گا کہ میرے بغیر زندگی کے کیا معنی ہیں؟۔۔۔ پھر سے غارت کرنے کے لیے اس کی صحت بھی اچھی ہو چکی ہو گی۔ پھر وہ کیسے لپٹے گی۔۔۔ اُلٹا مجھی سے کہے گی ”تو کہاں چلی گئی تھی، موہنی؟“

موہن وکٹوریہ ٹرمینس کے پلیٹ فارم سے باہر نکلنے کے لیے مُڑا، تو اسی طرف سے کوئی دوسری گاڑی پلیٹ فارم پہ آرہی تھی۔ موہن چونک گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے سومترا اُس گاڑی سے گئی اور اس سے لوٹ آئی ہے۔ جبھی اس نے ایک موٹی عورت کو کمپارٹمنٹ کے دروازے میں پھنسے ہوئے دیکھا۔ مسکرایا اور چل

دیا۔ اِسے ریڈیو کلب جانا تھا۔ تاش کے کچھ مداریوں کے ساتھ فلاش کھیلنے کے لیے، جہاں بیچ بیچ میں کبھی کبھی پان کی بیگم زندہ ہو جایا کرتی تھی اور سمندر سے آنے والے جھکّڑ میں اس کی عنابی ساری کا پلّو کسی نہ کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا تھا۔ پلّو کے ہٹائے جانے تک ساری میں لپٹے ہوئے ایک وجود کے بجائے دو کا احساس ہونے لگتا۔۔۔

موہن جا رہا تھا۔ اَن جانے میں گھر اور کار کی چابیاں اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی پہ گھوم رہی تھیں۔ دایاں ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا، جس سے وہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ٹٹول رہا تھا، جبھی اس کی نظر سامنے پڑی۔

"اچّی!" وہ رُکتے ہوئے بولا۔

موہن اَچلا کو جانتا تھا، لیکن کوئی خاص اتنا بھی نہیں۔ اَچلا کے شوہر رام گدکری کو تو وہ شاید زندگی میں ایک آدھ بار ہی ملا ہو گا، لیکن اَچلا سے اکثر مِشٹان میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں، جہاں وہ اپنی ایک اوباش سی سہیلی۔۔۔ دیبی کے ساتھ

ویجیٹیرئن کھانا کھانے آیا کرتی تھی۔ نمستے نمستے کے علاوہ موہن جام اور اَچلا گدکری کے بیچ آٹھ دس نہیں، تو بارہ پندرہ فقرے ہوئے ہوں گے جن سے پتہ چلا تو صرف اتنا کہ وہ بھی کولابہ میں رہتی ہے۔ فرق یہ تھا کہ موہن کف پریڈ کے ایک اچھے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور اَچلا کازوے پر ایک پُرانی بلڈنگ میں رہتی تھی۔

شاید موہن اسے 'اچّی' کے نام سے نہ پکارتا، لیکن دیبی نے موہن کا اس سے تعارف ہی اسی نام سے کروایا تھا۔ دیبی کو موہن اچھی طرح جانتا تھا۔ دیبی سمجھتی بھی تھی کہ پانی مصری کے لیے کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ اس پہ بھی وہ چھوٹتے ہی کسی بھی پرائے مرد سے گھُل مل جاتی تھی۔ اس کی آزاد زندگی کچھ ایسا ہی شربت تھی جو زندگی کی ٹھِلیا میں رات بھرا پڑا رہتا ہے۔ صبح تک پانی کسی تبخیر سے اُڑ جاتا ہے اور پھر سے مصری کی ڈلیاں ٹھلیاں کی تہ میں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ پہلے سے بھی صاف شفاف، چمکیلی، نوکیلی۔۔۔

موہن کے پُکارنے پر اَچلا نے گھوم کر دیکھا اور صرف اتنا کہا۔۔۔ ''مو۔۔۔'' اور

کچھ دیر کے بعد بولی۔۔۔ ''ہن۔''

اور پھر اس نے اپنی ساری کے پلّو سے آنکھوں کی نم پونچھ ڈالی۔ اب وہ مُسکرا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایکا ایکی کسی نے کوئی سنہرا تاج اُس کے سر پر رکھ دیا۔ تھوڑا موہن کے قریب آتے ہوئے وہ بولی۔۔۔ ''آپ!۔۔۔ یہاں کیسے؟ ''

''بیوی کو چھوڑنے آیا تھا'' موہن نے جواب دیا۔۔۔ ''کشمیر جا رہی ہیں۔۔۔ بچّے کی چھٹیاں ہو گئیں نا۔۔۔ آپ؟۔۔۔''

''میں؟''۔۔۔ اور اَچلا ایک دم کھکھلا کر ہنس دی اور پھر اسی دم چُپ بھی ہو گئی۔ کچھ شرماتے ہوئے بولی۔۔۔ ''میں اُن کو چھوڑنے آئی تھی۔۔۔''

''او''۔۔۔ اور موہن بھی ہنس دیا۔ ایک نظر اَچلا پہ ڈالنے کے بعد وہ دوسری گاڑی کے انجن کی طرف دیکھنے لگا، جس میں سے ابھی تک دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ پھر اَچلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔ ''کہاں گئے گدکری صاحب؟''

"دلّی۔"

"کب آئیں گے؟"

"یہی کوئی۔۔۔ ہفتہ دس دن میں" اَچلا نے کہا۔ "کوئی کانفرنس ہو رہی ہے۔"

"شاید زیادہ دن بھی لگ جائیں؟"

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔"

اور اَچلا اپنے بالوں کو سنوارنے لگی، جو پہلے ہی سنورے ہوئے تھے۔ صرف ان میں ایک پِن ڈھیلا ہو کر قدرے اُوپر اُٹھ آیا تھا، جسے اَچلا نے اپنے مومی ہاتھوں سے دبا دیا۔ جبھی اسے یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ دیر تک اُوپر اُٹھے رہے ہیں۔ موہن کی نظر اُس کے پورے بدن کا طواف کرتی ہوئی ایک پل بہت دیر اس کے بدن کے اُس حصّے پر جارُکی تھی، جو چولی اور ساری کے درمیان ہوتا ہے۔ ایکاایکی ہاتھ نیچے کرتے ہوئے اس نے ساری سے اپنے بدن کے ننگے حصّے کو ڈھک لیا۔

موہن نے سوچا بدن کے اس حصّے کو انگریزی میں مڈرف کہتے ہیں اور شہد کی مکّھی کی طرح اسٹیشن سے باہر نکلنے تک یہ لفظ اس کے دماغ میں بھنبھناتا رہا۔۔۔ مڈرف۔۔۔ مڈرف۔۔۔ مڈرف۔۔۔ مڈرف۔

اور موہن نے اسے دماغ سے نکالنے کی کوشش بھی نہ کی۔ سب بے کار تھا۔ موہن جانتا تھا۔۔۔ مکّھی کتنی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بار بار اُڑ کر پھر وہیں آ بیٹھتی ہے جہاں سے اُڑی تھی۔ جھلاّ کر اسے ہٹانے کی کوشش کریں تو ناک ٹوٹ جاتی ہے، مکّھی چھوٹ جاتی ہے۔

باہر گرمی بہت چکنی چکنی، گیلی گیلی تھی۔ بلاؤز سینوں سے چپک رہے تھے اور اس سونے کی طرح سے خوبصورت لگ رہے تھے، جو کانوں کو پھاڑے ڈالتا ہے۔ پسینے کے قطرے ساریوں اور پتلونوں کے اندر ہی اندر پنڈلیوں پر ٹپکتے اور جونک کی طرح رینگتے معلوم ہو رہے تھے۔۔۔ اسٹیشن کا چلتا پھرتا پیاؤ پیچھے رہ گیا تھا اور یہ اسی کی وجہ سے تھا، جو پیاس اور بھی تیکھی ہو رہی تھی۔ باہر ہال کے ایک کونے میں تھوڑی جگہ تھی، جہاں اوپر چھت پہ دو پروں والا پنکھا سست سی رفتار سے

چل رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک بڈھا مُنہ کھولے ہوئے سو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی لاش شناخت کے لیے شہر کے مُردہ خانے میں پڑی ہے۔۔۔

موہن اور اَچلا نے دو چار باتیں کیں اور اس کے بعد ان کی باتیں ختم ہو گئیں۔ دونوں اپنے اپنے ذہن میں کوئی موضوع ڈھونڈ رہے تھے، جو زیادہ سوچنے کی وجہ سے ہاتھ میں نہ آ رہا تھا۔ اَچلا دو قدم آگے جا رہی تھی اور موہن پیچھے۔ جبھی اَچلا میں اپنے بدن کے ان خطوں کا شعور عود کر آیا، جنہیں عورت بدصورت سمجھتی ہے اور مرد خوبصورت سمجھتے ہیں اور ہر عورت انہیں مُفت میں دکھانا نہیں چاہتی۔ وہ یا پیسے مانگتی ہے یا محبت۔۔۔ محبت۔۔۔ جو ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور جسے کپڑے پہنا دیے جائیں تو وہ محبت نہیں رہتی۔ اَچلا نے اپنے جسم کے پچھلے حصّے پہ ساری کھینچ لی۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نظروں کی برچھیاں پیچھے سے اس کے بدن کے ہر پور پہ لگ رہی ہیں۔

"اچھّا موہن جی" وہ مُڑتے ہوئے بولی۔۔۔ "میں اب گھر جاؤں گی۔"

”کیسے جائیں گی؟“ موہن نے پوچھا۔

”ایسے“ اور اَچلا نے تھوڑا چل کے دکھایا اور پھر دونوں کھِلکھِلا کے ہنس دیے۔ اِتنی سی بات میں دونوں کے بیچ ایک یگانگت پیدا ہو گئی تھی۔ آخر موہن نے کہا۔۔۔ ”میرا مطلب ہے۔۔۔ آپ گاڑی نہیں لائیں؟“

”اچّی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔ ”مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔“

”مَیں جو ہوں“ موہن نے کہا ”آج تھوڑی دیر کے لیے مجھے ہی اپنا ڈرائیور سمجھ لیجیے۔“

”جی؟“ اَچلا بولی۔ ”نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں۔۔۔ میں بس سے چلی جاؤں گی۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں؟“

”آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں“ کا جُملہ ہی ایسا ہے جس سے کوئی کسی کو تکلیف دینا چاہتا ہے اور اس کے بچ نکلنے کی گنجائش بھی رکھتا ہے۔ گویا اسے ٹٹولتا ہے، تم میرے ساتھ کس حد تک بڑھ سکو گے؟ یہ جُملہ مرد کہے تو ایک عام سی بات ہوتی

ہے، لیکن عورت کہے تو خاص بات۔۔۔ یہ عورتوں کے فقرے، جیسے ۔۔۔ ’’جھوٹے کہیں کے‘‘۔۔۔ ’’میں مر گئی‘‘۔۔۔وغیرہ۔

’’اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟‘‘ موہن بولا۔۔۔ ’’میں گھر ہی تو جا رہا ہوں۔ راستے میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔‘‘

گوریڈیو کلب موہن کے دماغ سے اپنے آپ براڈکاسٹ ہو گئی تھی۔

تھوڑی حیص بیص کے بعد اَچلا گدکری، موہن جام کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی فرئیر روڈ کی طرف سے نکلی۔ کراسنگ پہ پولیس مین نے اُلٹا ہاتھ دے رکھا تھا، جس کی وجہ سے موہن کو گاڑی روکنی پڑی۔ موہن پولیس مین کے اُلٹے ہاتھ پہ ہمیشہ جھلّایا اور منھ میں گالیاں بھنبھنایا کرتا تھا، لیکن آج وہی ہاتھ اسے مسیح کا ہاتھ معلوم ہو رہا تھا۔

’’دیبی کیسی ہے؟‘‘ موہن نے گفتگو کا موضوع ڈھونڈ ہی لیا۔

اَچلانے جواب دیا۔ ’’ویسی ہی۔۔۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ موہن نے چونک کر کہا۔ ’’میں تو سمجھتا ہوں، وہ ایک بہت ہی نیک لڑکی ہے۔‘‘

’’میں نے کب کہا، بُری ہے؟‘‘ اچّی بولی اور ہنسنے لگی۔

موہن اچّی کے جال میں آگیا تھا اور اب یونہی بچ نکلنے کے لیے اِدھر اُدھر اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ پسینے کے باریک سے قطرے اس کے ماتھے پہ چلے آئے۔ اَچلا اس سے دور ہٹ کر دروازے کے ساتھ لگی بیٹھی تھی جیسے کپڑا بھی چھُو گیا تو کوئی رشتہ پیدا ہو جائے گا۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے موہن بولا۔ ’’آپ مجھ سے اتنی دُور کیوں بیٹھی ہیں؟‘‘

’’یونہی‘‘ اَچلا نے کہا اور مشکل سے انچ بھر موہن کی طرف سرک آئی۔۔۔ ’’میں نے سوچا آپ کو گیئر بدلنے میں تکلیف نہ ہو۔‘‘

’’پھر وہی۔۔۔تکلیف‘‘!

جب تک پولیس مین نے ہاتھ دے دیا تھا، لیکن موہن کی کار بدستور کھڑی تھی۔ پولیس مین کی سیٹیاں اور پچھلی کاروں کے ہارن ایک ساتھ سنائی دینے لگے۔ موہن نے جلدی سے گاڑی کو گیئر ڈالا اور گھبراہٹ میں فوراً پیر کلچ پر سے ہٹا لیا۔ گاڑی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی۔ بند ہوتے ہوتے رُکی۔ پولیس مین سے کچھ آگے نکلے تو اَچلا بولی۔ ”کیا آپ گاڑی ایسے ہی چلاتے ہیں؟“

”نہیں“ موہن نے کہا۔۔۔ ”میں تو اتنے پیار سے چلاتا ہوں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔۔۔ مگر آج۔۔۔“

”آج کیا ہوا؟“۔۔۔

”آپ ہوئی ہیں۔۔۔ اور کیا ہوگا؟“

موہن اور اَچلا دونوں ٹاؤن ہال کے سامنے جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں موہن کا جی چاہ رہا تھا، آج کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ ایک بس تیزی سے گزری اور موہن کو اپنے اندر اس عجیب سی خواہش کو دبانا پڑا۔ سامنے ٹاؤن ہال کی طرف جاتی

ہوئی سیڑھیوں پر سے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے موہن نے کہا۔۔۔

”کتنا اچھّا ہے۔“

”بہت اچھّا ہے۔“

الفسٹن سرکل کی طرف سے جوانی کے عالم میں بپھری ہوئی ایک بے حد خوبصورت لڑکی ایک لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رجسٹرار کے دفتر کی طرف جارہی تھی۔ شاید اس کی شادی ہونے والی تھی، اسی لیے اس کا چہرہ کسی اندرونی تمازت سے تمتمایا ہوا تھا۔ اَچلا نے موہن سے پوچھا۔ ”آپ کو کیسی معلوم ہوتی ہے؟“

”اچھی۔“

اور موہن نے ”اچھی“ کچھ اس انداز سے کہا کہ اچھی اور اچّی میں کوئی فرق نہ رہا۔ اچّی خوش ہو گئی، کوئی کیا کر سکتا تھا۔۔۔ وہ خوش ہو گئی۔ یونہی دکھاوے کے لیے بولی۔ ”میں اتنی خوبصورت کہاں ہوں؟“

موہن نے ایک نظر اَچلا کی طرف دیکھا اور وہ سب کہہ دیا جو وہ یوں نہ کہہ سکتا تھا۔

کاماہال، لوائین گیٹ گزر گئے اور اب موہن کی گاڑی ریگل سینما کے پاس سے نکل رہی تھی۔ سامنے کا بُت من موہنا تھا۔ پھلیرے کی دُکان اچھی تھی۔۔۔ گاڑی کازوے پر ستیہ سدن کے سامنے رُک گئی جہاں اچّی رہتی تھی۔

اچّی نے چھچلتی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سوائے سامنے کے ٹیلر ماسٹر کے، جو اچّی کا ناپ جانتا تھا، کسی دوسرے نے اَچلا کو دوسرے کسی کی کار سے اُترتے نہ دیکھا تھا۔ دیکھتا بھی تو اِسے کیا پروا تھی؟ موہن کو کیا حیا تھی؟ اس پہ بھی ایک دم دروازہ کھول کر اَچلا گاڑی سے اُتر گئی۔ تھوڑا ٹھٹھک کر۔۔۔ ''اچھّا موہن جی، بہت بہت شکریہ'' کہا اور چل دی۔

موہن بدستور ڈرائیور کی سیٹ پہ بیٹھا تھا۔ ایک ٹانگ اندر تھی اور دوسری کھلے ہوئے دروازے کے باہر۔ وہ اُتر کر اَچلا کے لیے دروازہ کھولنا چاہتا تھا لیکن اس

نے موقع ہی نہ دیا۔ کچھ دور جا کر اَچلا کو جیسے کچھ یاد آیا۔۔۔ وہ تھوڑا رُکی اور جو کہا بھی تو صرف اس لیے کہ وہ اسے نہ کہنا چاہتی تھی اور اپنے اندر کسی فقرے کو روکے ہوئے تھی۔ لیکن۔۔۔ بعض وقت جسم رُوح سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔۔۔

"کبھی آیئے گا موہن جی۔"

اور موہن کے جواب کا انتظار کیے بغیر اَچلا گھر کی طرف لپک گئی۔ پیچھے جیسے موہن ہَوا سے باتیں کر رہا تھا۔ "آؤں گا، آؤں گا کیوں نہیں؟"

اَچلا کا خیال تھا۔۔۔ موہن اتنا تو سمجھ دار ہو گا ہی۔ اِن کے گھر نہ ہونے پہ۔۔۔ کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دعوت تو صرف تکلف کی بات تھی۔۔۔!

موہن واقعی سمجھ دار تھا، ورنہ وہ دوسرے ہی دن اَچلا کے ہاں پہنچ جاتا؟ جب کہ اپنے پتی رام گدکری کا اَچلا کے دماغ میں تصوّر بھی نہ تھا۔

موہن جام نے گھنٹی کچھ اِس زور سے بجائی کہ اچلا گھبرا کر بھاگی چلی آئی۔ جیسے

رام اگلے ہی روز کسی پشپ بوان پہ بیٹھ کے آ گئے۔ ابھی تو۔۔۔ اَچلا کو کپڑے بھی ٹھیک کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے تھوڑا سا منھ باہر نکالا اور پھر ایکا ایکی پیچھے ہٹ گئی، اپنے آپ میں سِمٹ گئی اور بولی۔۔۔ ”ذرا رُک جایئے۔۔۔“

پر وہ اندر بھاگ گئی۔

موہن میں اتنی تاب ہی کہاں تھی؟ وہ تو نیچے ہی سے یوں آیا تھا، جیسے فسٹ گیئر میں لگا ہو۔ اس نے دروازے کو یوں ہلکا سا دھکّا دیا اور وہ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ڈرائنگ روم میں تھا اور سر گھما گھما کر اندر کی سب چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے تو سر پہ بھی جیسے کوئی آنکھ تھی۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے اَچلا کا بیڈ روم صاف دکھائی دے رہا تھا۔

عورت اور گھر میں فرق ہی کیا ہے؟ کم سے کم پوچھ تو لینا چاہیے۔ آخر اتنا بھی کیا؟ لیکن موہن پیر سے سر تک اُمڈا ہوا تھا، جیسے اَچلا بیڈ روم کے کھلے دروازے میں

سے سمٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں بالکل ایسے تھے جیسے جذبات اور خیالات، آنکھوں اور جسم کے اعتبار سے بھگوان نے انہیں بنایا تھا۔ اَچلا پلنگ کی پائنتی پر سے ساری اُٹھا کر جلدی جلدی میں اُسے نیچے کے کپڑوں پہ لپیٹ رہی تھی۔

"معاف کیجیے۔۔۔" موہن جام نے وہیں سے کہا اور وہیں سے ویسا ہی اَچلا نے جواب دیا۔۔۔ "کوئی بات نہیں۔"

ڈرائینگ اور بیڈروم کے بیچ ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ جہاں شیشے کے ایک کیبنٹ کے اندر شیو جی بھولے ناتھ کی تصویر ٹنگی تھی اور اس پہ ایک باسی ہار لٹک رہا تھا۔ یہی نہیں، ساتھ کنواری مریم کی شبیہہ بھی تھی اور گورو نانک کی بھی۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی باہر ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا جس پر لیڈا ننگی کھڑی تھی اور ایک راج ہنس اسے اپنے پَروں میں دبائے، چونچ اُٹھائے خوشہ چینی کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ایک لمحے میں موہن جام نے دُنیا بھر کی عورتیں دیکھ لی تھیں۔ سومترا دیکھ لی تھی اور دیبی دیکھ لی تھی، زازا گیبور دیکھ لی تھی، کوئی اور بھی دیکھ لی تھی اور رادھا دیکھ لی تھی جو موہن کی سگی بہن تھی اور پاریل میں اپنے دیونگ ماسٹر پتی کے ساتھ رہتی تھی۔

موہن نے ہمیشہ عورت کو مایا کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ باہر سے اور، اندر سے اور معلوم ہوتی تھی۔ اچھا اور بُرا، گناہ اور ثواب، کبھی خوبصورت، کبھی بدصورت طریقے سے آپس میں گھلے ملے ہوتے تھے۔ پھر، جو عورت کپڑوں میں بھری پُری دکھائی دیتی، وہ دُبلی نکلتی اور دُبلی دکھائی دینے والی بھری پُری۔۔۔ اسے ہی تو مایا کہتے ہیں یا لیلا۔ مثلاً ایسی تندرست عورت جسے دیکھتے ہی گُردے میں درد ہونے لگے، اس سے ڈرنا بے کار کی بات ہے اور ہڈیوں کے ڈھانچے سے اُلجھنے پہ اتنا بھی نفع نہیں ہوتا، جتنا کسی مزدور کو بیس سیر لکڑیاں کاٹنے سے۔

مایا۔۔۔ جس کے بارے میں سوچیں کہ رام ہوئی، وہیں حکمت ناکام ہوئی اور جس

کے بارے میں کہیں "یہ ہاتھ نہ آئے گی" وہی گردن دبائے گی۔۔۔ اور مایا کیا ہوتی ہے؟۔۔۔ البتہ ایک اور مایا ہوتی ہے جو پالینے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس دُنیا سے جاتے سمے یوں معلوم ہوتا ہے، آپ نے کسی کو نہ پایا، آپ کو سب نے پالیا۔

جبھی ساری اور بالوں کو ٹھیک کرتی ہوئی اچّی ڈرائینگ روم میں چلی آئی۔ وہ کتنی حسین لگ رہی تھی۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ دوسری عورت تھی؟ نہیں نہیں، وہ پہلی ہوتی تو بھی اتنی ہی خوبصورت معلوم ہوتی۔ اس میں۔۔۔ کوئی بات تھی، جو کسی دوسری میں نہ تھی۔ لیکن۔۔۔ ایسا تو پھر ہر ایک کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس کی بھوؤں پہ بچپن کی کسی چوٹ کی وجہ سے ہلکی سی خراش تھی، جس نے بالوں کی تحریر کو دو حصّوں میں بانٹ دیا تھا اور وہ خراش ہی تھی جسے چُوم چُوم لینے کو جی چاہتا تھا۔

موہن کے قریب آتے ہوئے پھر سے ہاتھ اُوپر اٹھا کر اچّی نے سامنے سے اپنے بال قدرے اوپر اُٹھا دیے۔ بالوں کا ایک Tiara سا بن گیا تھا۔ سونے اور

ہیرے کے تاج جس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی ہی ساری کے پلّو سے اپنے آپ کو ہوا کرتی ہوئی آئی۔ ’’اُف! آج کتنی گرمی ہے۔۔۔‘‘

اور پھر ہاتھ دائیں طرف بڑھاتے ہوئے دیوار پہ پنکھے کے سوچ کو دبا دیا۔ جبھی موہن بولا۔۔۔ ’’میں بھی سوچ رہا تھا۔۔۔‘‘

’’کیا سوچ رہے تھے آپ؟‘‘ اَچلا نے ایک منتظر نگاہ سے موہن کی طرف دیکھا۔

’’یہی‘‘ موہن نے کہا ’’آج کتنی گرمی ہے۔ اُف‘‘!

اور جب پنکھے سے ہوا کا پہلا جھونکا آیا، تو موہن اور اَچلا تسکین کا سانس لیتے ہوئے، آمنے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئے۔ کتنا ظلم تھا۔ وہ ایک دوسرے کے پاس بھی نہ بیٹھ سکتے تھے۔ سب کچھ کتنا غیر فطری معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک بھی تھا۔ اگر دنیا بھر کے مرد عورت ’فطری‘ زندگی گزارنے لگیں تو کیا ہو؟ لیکن۔۔۔ مرد اور عورت دونوں نامکمل ہیں۔ ان کی تکمیل۔۔۔؟ جسموں کو ماریے گولی، روحوں کو پالینے کے بھی کیا الا سکا سے ہو کر آنا پڑے گا؟

ایسے ہی تکلف میں لوگ ایک دوسرے سے میلوں دور چلے جاتے ہیں۔ پھر عجیب طرح کشاکش شروع ہوتی ہے، جان نہ پہچان اور آتے ہی ہاتھ پکڑ لیا اور یہ بھی ۔۔۔ پہلے کیوں نہ بُلایا؟ کیا سمجھتے ہو؟ ۔۔۔ محبت کے کھیل میں تو پہلی نظر، پہلا جملہ اور پہلی ہی حرکت ابد یہ چھا جاتی ہے۔۔۔ ایک دن دیبی ایک پینٹر کے بارے میں کہہ رہی تھی، جس سے وہ محبت کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے —" میں تو اپنا سب کچھ اس پر لُٹا دیتی، لیکن چھوٹتے ہی کیسے بھونڈے طریقے سے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے سب چھوٹے بڑے راز جاننے کی کوشش کرنے لگا۔۔۔ ایسے تھوڑے ہوتا ہے؟ میں نے اس بھونڈے طریقے سے اسے روک دیا۔ اب میں اس کے پیچھے بھاگ رہی ہوں اور وہ کسی ضد میں پڑ گیا ہے۔ جانے سمے کا وہ کون سا انش تھا جس میں۔۔۔ سنا ہے وہ اگری پاڑے میں کسی رنڈی کے پاس جاتا ہے۔۔۔"

اَچلا کے کوئی بچہ نہ تھا۔ پانچ چھ سال کی شادی کے باوجود اس کی مامتا ویسے ہی دبی پڑی تھی۔ البتہ پندرہ سولہ برس کی ایک نوکرانی تھی جو اچّی کے اشارے پر چائے

بنا کر لے آئی۔ پھر ایک پلیٹ میں ختائیاں بھی لائی، جو اَچلا نے گھر میں ہی بنائی تھیں، جن پہ پستہ فراوانی سے بکھرا ہوا تھا۔ نوکرانی نے موہن کو، کبھی دیکھا نہیں، کے انداز میں دیکھا اور پھر رسوئی میں کام کرنے کے لیے چلی گئی۔

"لڑکی اچھی معلوم ہوتی ہے" موہن نے ختائی منھ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اور اَچلا نے اندر کی طرف دیکھا "پر جوان لڑکیوں کو گھر میں رکھنا نہیں چاہیے۔"

"کیوں۔۔۔ رکھنا کیوں نہیں چاہیے؟"

"کیا بتاؤں؟" اَچلا ہنس دی "روز کوئی نیا البیلا دروازے پر موجود ہوتا ہے۔"

اور پھر دونوں مل کر ہنسے۔ موہن نے بات شروع کی۔۔۔ "میں بھی تو ہوں۔"

اچّی کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ نگاہیں چُراتے، چائے میں چمچ ہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ کی بات دوسری ہے۔" اور پھر ایکا ایکی۔۔۔ "اب کے رام آئیں گے تو

انہیں آپ سے ملواؤں گی، بڑے مزے کے آدمی ہیں۔"

موہن نے چھیڑا۔۔۔ "اس کا مطلب ہے، اس سے پہلے نہ آؤں؟"

"نہیں نہیں" اَچلا نے گھبراتے ہوئے کہا۔۔۔ "آپ جب جی چاہے، آیئے۔۔۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔"

پھر اَچلا نے سوچا، وہ کیا کہہ گئی، عورت ہونا بھی ایک ہی مصیبت ہے۔ کیوں وہ ہر وقت ڈری رہتی ہے۔ کیوں، کہتی کچھ ہے، مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

اور اَچلا نے رام گدکری کی باتیں شروع کر دیں۔ جیسے ان سے اچھا مرد کوئی اس دنیا میں نہیں۔ ایک رام ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے اور ایک اب بیسویں صدی میں پیدا ہوئے ہیں اور کولابا میں رہتے ہیں۔

موہن جام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سومترا کی باتیں کرے۔ دونوں میں فاصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا اور برابر بڑھتا جارہا تھا۔ ان کے جانے بوجھے بغیر، وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

موہن نے بتایا، سومترا بڑی گریٹ عورت ہے، لیکن اس کی صحت کی خرابی نے پوری زندگی پہ ایک غم کی چھاپ لگادی ہے۔۔۔

جبھی نوکرانی ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی۔۔۔ ”بائی، میں جاؤں؟“

”نہیں نہیں“ اَچلا نے موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ”کپڑے دھوؤ جا کر، دیکھتی نہیں غسل خانے کے پاس کتنا ڈھیر لگا ہے؟ چلو، چلو۔۔۔“

اور نوکرانی مُنہ پھُلاتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

موہن بدستور سومترا کے بارے میں کہہ رہا تھا۔۔۔ ”دس سال سے جس عورت نے تمہارا ساتھ دیا ہو، اُسے تم صرف اس لیے چھوڑ دو کہ وہ بیمار ہے، جس نے اپنی جوانی کے بہترین سال تمہاری خدمت میں لگا دیے اور جس کی صحت کی خرابی کے تم ذمّے دار ہو۔۔۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔“

اور موہن کی آنکھوں میں آنسو چلے آئے۔

اَچلا کو نہ جانے کیا ہوا، اس میں برسوں سے دبی ہوئی کوئی چیز اُبل پڑی۔۔۔ ''نہیں نہیں موہن جی'' وہ بولی۔۔۔ ''ٹھیک ہو جائیں گی'' اور پھر موہن کے ایک دم پاس پہنچتے ہوئے اس نے اپنی ساری کے پلّو سے موہن کی آنکھیں پونچھ دیں۔

موہن ایک قطعیت کے ساتھ اُٹھا اور بولا۔۔۔ ''اچھّا،۔۔۔میں چلوں گا۔''

''بیٹھیے تو کچھ دیر'' اَچلا نے پھر ویسا ہی جملہ کہا۔

لیکن موہن نے انکار کر دیا۔ اس نے جلدی سے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور بولا۔۔۔ ''مجھے ساڑھے گیارہ بجے اجوانی پیپر ملز میں جانا ہے۔''

اور موہن فریادی نظروں سے اَچلا کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

اَچلا اُٹھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بیڈروم میں جا کر اس نے اپنے سراپا کی طرف دیکھا۔۔۔وہ کیسی لگ رہی تھی۔ اسے اپنا آپا اچھا لگا۔ پھر وہ نوکرانی کے پاس پہنچی۔

"تمہارا جوہنی نہیں آیا؟" اَچلا نے کہا۔

اس بات کا جواب دینے کے بجائے روزی بولی۔۔۔ "وہ صاحب جو آئے تھے، چلے گئے؟"

"ہاں" اَچلا کو کتنی تسلّی تھی۔

"تم جوہنی کے ساتھ پکچر چلی جانا" اچّی نے کہا "تمہارے سب لڑکوں سے ایک وہی مجھے ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔۔۔"

اور روزی ایکا ایکی خوش ہو اُٹھی۔

اچّی سے موہن کی غالباً یہ پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی۔ اب وہ ٹیلر ماسٹر اور دوسرے لوگوں کی نظروں سے بچتی بچاتی موہن کی گاڑی میں آ بیٹھتی تھی اور دونوں شام کی ہَواخوری کے لیے نکل جاتے تھے۔

اس اثنا میں موہن نے سومترا کو ہفتے میں ایک چِٹھی لکھنے کی بجائے تین تین لکھنا

شروع کر دیں۔ ایک چٹھی میں تو مذاق بھی کیا۔۔۔ اگر تم نہ آؤ گی تو میں کسی دوسرے سے لو لگالوں گا۔ اور یوں اس نے سومترا کو بے فکر کر دیا۔

ایک شام کُوپر تج کے پاس سے ہوتی ہوئی گاڑی، بیک بے کے پاس اندھیرے میں کھڑی ہو گئی۔ اَچلا نے بھی اعتراض نہ کیا۔ آج وہ بائیں دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کے بجائے سیٹ کے عین بیچ میں بیٹھی تھی۔ موہن جام کے ہاتھ سیٹ پہ اچّی کے گرد تھے اور اچّی ایک ہاتھ سے نیوٹرل میں پڑے ہوئے گیئر کو فرسٹ اور سیکنڈ میں لگا رہی تھی، جیسے وہ گاڑی چلانے کی کوشش کر رہی ہو۔

موہن نے اَچلا کا ہاتھ تھام لیا۔ مزاحمت تو ایک طرف، اس نے موہن کا ہاتھ دبا دیا، اور دونوں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ حتیٰ کہ موہن کو کہنا پڑا۔۔۔

"گدکری کب آنے والے ہیں؟"

"یہی کوئی دو ایک دن میں۔"

"کانفرنس لمبی ہو گئی؟"

"بھگوان جانے ۔۔۔ان مردوں کا کیا پتہ، کسی سوتن کے سنگ راس رچا رہے ہوں۔"

"کیا بات کر رہی ہو؟" موہن نے اپّی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔۔۔"وہ تو بھگوان رام ہیں تمہارے لیے۔"

"بھگوان رام ہوتے تو سیتا کو ساتھ نہ لے جاتے؟"

موہن نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔"اب سیتا کانفرنس میں تھوڑے جا سکتی ہے؟"

اور موہن نے اپّی کو بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کچھ اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اپّی نے تھوڑی سی مزاحمت کی۔ لیکن پھر جیسے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یوں بھی کسی آسائش کی ضرورت تھی، کیونکہ جب سے گاڑی بیک بے میں آ کر اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی، اس نے اندر ہی اندر کانپنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی نسوں کو کسی آرام کی ضرورت تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا سر موہن کی چھاتی پہ رکھ دیا۔۔۔

موہن اَچلا سے پیار کرنے ہی والا تھا کہ ایک آدمی گاڑی کے پاس چلا آیا اور بولا۔۔۔ ”ناریل پانی۔“

”نہیں چاہیے“ موہن نے اَچلا سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن ناریل والے کو بدستور وہیں کھڑے پاکر وہ ایک دم جھلّا اُٹھا۔۔۔ ”ابے کہانا۔۔۔ نہیں چاہیے۔“ اور پھر۔۔۔ ”جاتا ہے یا؟۔۔۔“ اور موہن جیسے اسے مارنے کے لیے لپکا۔

اَچلا نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔۔۔ ”کیا کر رہے ہیں؟“ کچھ گھبراتے اور اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے بولی۔۔۔ ”دیکھتے نہیں۔ اس کے ہاتھ میں چھُری ہے؟“

”ہوگی“ موہن نے بے پروائی کے انداز میں کہا۔

ناریل والے نے اپنی مالاباری زبان میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ کچھ دور پتھر کی دیوار پہ بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے آواز دی۔۔۔ ”مجاکرابابو۔۔۔ مجاکرا۔۔۔“

موہن تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور اَچلا سے کہنے لگا۔۔۔ ”گھر چلتے ہیں۔“

”کس کے گھر؟“

”میرے۔۔۔ تمہارے، روزی کیا وہیں ہو گی؟“

”نہیں۔۔۔ وہ پکچر دیکھنے گئی ہے، اپنے جوہنی کے ساتھ۔“

”تو پھر۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔“

”نہیں نہیں“ وہ بولی۔۔۔ ”گھر پہ ہمیں کیا کرنا ہے؟“

دراصل اچلا کو گھر میں وہ شیشے کا کیبنٹ اور اس میں لگی ہوئی تصویریں یاد آ گئی تھی۔ وہ تو اپنے شوہر سے بھی پیار کرنے سے پہلے بیچ کا دروازہ بند کر لیا کرتی تھی۔ اس کے بعد پتھّر پہ بیٹھے ہوئے بے فکرے کی موجودگی کے احساس سے بے خبر ہو کر جب موہن نے اَچلا کا مُنہ چُوما تو اس میں پہلی سی خود سپردگی نہ رہی تھی۔۔۔ ”نہیں نہیں۔“ اس نے خفیف سا کہا، جو احتجاج تھا اور نہیں بھی۔ البتہ جب موہن نے ہاتھ بڑھا کر اچّی کے چھوٹے بڑے راز معلوم کرنے کی کوشش کی تو وہ بدک کر الگ ہو گئی۔ موہن کو بُرا سا لگا۔ اُس نے کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد پھر

ایک بھرپور حملہ کیا، لیکن اَچلا کسی نہایت مضبوط قلعے میں محبوس ہو بیٹھی تھی۔ وہ شکایت کے لہجے میں بولی۔۔۔ ''نہیں نہیں، اتنا ہی بہت ہے۔''

''بے وقوف نہ بنو، اچّی'' موہن نے برافروختہ ہو کر کہا۔۔۔ ''نہیں تم بھی دیبی کی طرح پچھتاؤ گی۔۔۔''

''نہیں موہن'' اَچلا نے بڑے پیار سے روٹھتے ہوئے کہا۔۔۔ ''پیار کا یہی مطلب تھوڑے ہوتا ہے؟''

''جو ہوتا ہے، وہ سمجھا دو۔''

''کیوں؟۔۔۔ بہن بھائی کا پیار نہیں ہوتا؟''

''ہوتا کیوں نہیں؟'' موہن نے اپنی مردانہ خفت کو چھُپاتے ہوئے کہا، اور اسے اپنی بہن رادھا یاد آ گئی جو پاریل میں رہتی تھی۔۔۔

''یہ رشتہ تو ہم ہمیشہ نہیں رکھ سکتے'' اچّی بولی۔۔۔ ''ایک دو روز میں یہ آ جائیں

گے۔۔۔ مہینے ڈیڑھ مہینے میں سومترا بہن بھی لوٹ آئیں گی۔"

"ہوں۔"

"بہن بھائی کا پیار ہے جس میں کوئی ڈر نہیں، کوئی کھٹکا نہیں۔"

"ٹھیک ہے" موہن نے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔۔۔ "آج سے میں نے تمہیں بہن کہا" اور زنّاٹے سے گاڑی چلا دی۔

"اچّی بہت ڈر گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے موہن کا بایاں بازو پکڑ لیا اور شانے پہ اپنے بالوں کا خوبصورت تاج رکھتے ہوئے بولی۔۔۔ "تم تو رُوٹھ گئے۔۔۔"

"رُوٹھوں گا کیوں؟" موہن نے کہا۔۔۔ "بھلا بھائی بھی بہن سے روٹھ سکتا ہے؟" اَچلا نے جھٹکے سے اپنا سر موہن کے کاندھے سے ہٹا لیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی ستیہ سدن کے سامنے کھڑی تھی۔ آج دروازہ کھولنے کے لیے

موہن نے ذرا بھی جدوجہد نہ کی۔ اَچلا بے دلی سے اُتری۔ سامنے کا ٹیلر ماسٹر غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور آس پاس کے کچھ لوگ بھی۔ لیکن اَچلا کو جیسے کوئی ڈر نہ لگ رہا تھا۔ اس نے آج موہن کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ وہ بے حد متفکّر تھی۔ ایسے وسوسے اور ڈر اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے جنہیں وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ اسے ایک ڈر تھوڑے تھا۔۔۔ ہزاروں تھے جن میں سے ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا اور پہچاننا ممکن نہ تھا۔

''اب آؤ گے ؟'' اس نے پُوچھا۔

''آؤں گا، آؤں گا کیوں نہیں ؟'' موہن نے کہا اور پھر ایک دم کھکھلا کے ہنس دیا، جیسے کوئی بچّے کو ڈرا تو سکتا ہے، مگر ایک حد تک، اس کے بعد موہن 'ٹاٹا' کہہ کر چل دیا۔ اَچلا جب گھر لوٹی تو کسی قسم کا بوجھ اس کے سر سے اُتر چکا تھا۔۔۔

اگلے ہی روز گدکری چلے آئے۔

اچّی اُنہیں اسٹیشن پہ لینے گئی تو یہ دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس کے شوہر نے مونچھیں

رکھ لی ہیں۔

"یہ کیا؟" اَچلا نے پوچھا۔

"ایسے ہی" اس کے پتی نے ہنستے اور عاشقانہ نظر سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "من کی موج۔۔۔"

اور پھر قلی کے سر پر سوٹ کیس رکھواتے، اچّی کے پاس آتے ہوئے بولے۔۔۔ "بُری لگتی ہیں؟"

"نہیں، بُری نہیں لگتیں۔ مگر۔۔۔ یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی اور ہی مرد کے ساتھ جارہی ہوں" اَچلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رام گدکری نے چھیڑا۔۔۔ "اچھا ہے نا، ایک ہی زندگی میں دو مرد دیکھ لیے۔"

اس نے سوچا اچّی ہنسے گی اور اس لطیفے سے پورا لُطف اُٹھائے گی، یا دھپ سے پیٹھ پہ ہاتھ مار کے کہے گی "شرم نہیں آتی؟۔۔۔" لیکن اَچلا نے کچھ نہ کہا۔ اُلٹا جیسے

کسی فکر کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گزر گئی۔ ایک متجسّس نگاہ سے اس نے رام کے چہرے پہ دیکھا، جو مونچھوں کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ بے وقوف نظر آرہا تھا۔ اَچلا کو یقین ہو گیا، کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ اب وہ پیار کی باتیں کر رہی تھی مگر۔۔۔ مگر رام گدکری کانفرنس کا قضیہ لے بیٹھے تھے۔

گھر پہنچ کر اچّی نے اپنے پتی کو سامان بھی ٹھیک سے نہ رکھنے دیا۔ وہ ایک بچی کی طرح مچل گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر بیڈروم میں لے گئی اور اس کے گلے لگ کر زار زار رونے لگی۔ رام گدکری حیران ہی تو رہ گیا۔۔۔ ”ارے! گیارہ ہی دن تو لگے ہیں۔“

لیکن اچّی رو رہی تھی اور مچل رہی تھی۔ اسے لپٹاتے، دِلاسا دیتے ہوئے آخر میں رام نے کہا۔۔۔ ”مجھے کیا معلوم تھا، تم اتنا ہی ڈر جاؤ گی۔“

”میں یہ سب ڈر کے مارے کر رہی ہوں؟“ اَچلا نے ایک دم پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔پیار کے مارے۔" اور رام گدگدی ہنس دیا۔ آگے بڑھ کر پھر سے اچّی کو آغوش میں لیتے ہوئے بولا۔۔ "میں جانتا ہوں، اچّے۔۔۔میں بھی تم سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں۔"

"بس؟"

"اس سے بھی زیادہ۔"

"جھوٹے کہیں کے۔۔۔مجھ سے پیار کرتے تو یہ۔۔۔ مُونچھیں رکھتے؟"

اَچلا کا خیال تھا رام نے مُونچھیں کسی لڑکی کی انگیحنت پہ رکھی ہیں۔ رام سمجھ گیا۔ اسے اَچلا کے جذبات سے زیادہ اپنے سمجھ جانے پہ خوشی تھی۔ پیار میں اس نے منھ آگے بڑھایا تو اَچلا نے منھ پیچھے کی طرف موڑ لیا، جس پہ رام نے وعدہ کیا، اگلے ہی روز وہ مُونچھیں وونچھیں سب منڈوا ڈالے گا۔ اپنی ہی نہیں، جو بھی دکھائی دے گا، اس کی بھی۔۔۔

دو ایک روز کے بعد، وعدے کے مطابق موہن جام چلا آیا۔ پہلے تو اچّی چونکی۔ پھر

اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ اپنے پتی رام گدکری کی طرف لپکی اور بولی۔۔۔
”جی، میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں۔ میں نے نے اپنا ایک بھائی بنایا ہے۔“

”بھائی؟۔۔۔ بنایا ہے؟“

”ہاں“ اَچلا کہنے لگی۔۔۔ ”کیا بھائی نہیں ہوتے؟“

اور اسی طرح رام گدکری کو پکڑ کر اَچلا موہن جام سے ملوانے کے لیے اسے ڈرائینگ روم میں لے آئی۔ دونوں مرد ایک دوسرے سے اس طرح ملے، جیسے وہ ناسمجھی کے عالم میں ملتے ہیں۔ یہ نہیں کہ رام گدکری نے موہن جام کو ٹھیک طریقے سے اُٹھایا بٹھایا نہیں، یا اس کی مناسب خاطر مدارت نہیں کی۔ اس نے سب کچھ کیا، لیکن وہ ایسے ہی تھا جیسے آدمی کچھ نہیں سمجھتا، مگر کرتا چلا جاتا ہے۔ مسکراہٹیں بناوٹی تھیں، ہنسی بناوٹی تھی۔۔۔

اور اَچلا تھی کہ لُٹی جارہی تھی۔ ایک بار بھائی کہہ دینے کے بعد جیسے چھٹی ہو گئی۔ اس نے نہ صرف چائے ختائی وغیرہ سامنے رکھیں، بلکہ روزی کو بھی بازار بھیج

دیا۔ کچھ نمکین چیزیں لانے کے لیے۔ رام گدکری یہ سب برداشت کر رہا تھا، لیکن ایک چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی وہ یہ تھی کہ موہن جام کے آنے پر اَچلا اسے بھی بھول چکی تھی، جو اُس کا پتی تھا، اُس کے بھائی کا جیجا۔ اور رام گدکری دیکھ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں اَچلا کتنی بے بس ہے۔

جب کوئی چیز لینے کے لیے اَچلا اندر جاتی تو یہ مرد لوگ ایک دوسرے سے سرسری طور پر تکلف، محض تکلف میں ایک آدھ جُملہ کہتے۔ رام گدکری کچھ کانفرنس کا رعب ڈالنے کی فکر میں تھے اور موہن جام اس شپ منٹ کا ذکر کر رہے تھے، جو انہوں نے ابھی ابھی جاپان سے منگوایا تھا۔ دونوں کے فقرے بیچ میں ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔

اچّی اندر سے آئی تو وہ ساری بدلے ہوئے تھی اور سامنے کے بالوں میں پھر سے کراؤن بنالیا تھا اور خوشبو تو اس کے ساتھ ہی باہر لپکی آئی تھی۔

"بھابی نہیں آئیں بھائی صاحب۔۔۔؟" اَچلا نے پوچھا اور پھر رام گدکری کی

طرف منھ کرتے ہوئے بولی۔۔۔ ''وہ کشمیر گئی ہیں۔۔۔ میں ملی تو نہیں، پر سُنا ہے بڑی اچھی عورت ہیں۔''

''اچھی ہوں گی'' رام نے اِتفاق کیا۔

اور پھر رام متعجب سی نگاہ سے موہن جام کی طرف دیکھنے لگا۔

سب کچھ کھا چکنے اور مصافحہ کے بعد موہن جام اُٹھ کر چل دیا۔ ''میں ابھی آتی ہوں'' کہہ کر اَچلا دروازے تک اسے چھوڑنے گئی اور پھر کسی خیال کے آنے سے وہ دروازے سے نکل کر لینڈنگ تک، اور پھر لینڈنگ سے بھی نیچے چلی گئی۔ حالانکہ اس کا شوہر، مہمان کو رخصت کرنے کے لیے، تھوڑی دیر کے لیے محض تکلفاً اُٹھا تھا۔ یوں بھی سالے بہنوئی میں سالے کا رشتہ چھوٹا ہوتا ہے!

نیچے بازار میں آنے سے پہلے موہن جام کا جی چاہا، وہ اَچلا سے پیار کرے۔ اچّی کتنی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ صرف اس کا ہاتھ پکڑ سکا، جسے اس نے کچھ پیار سے دبایا اور بولا۔۔۔ ''اچّی! کبھی تم بھی میرے ہاں آؤ نا۔''

''آؤں گی''اچّی نے کہا اور پھر بولی۔۔۔''ان کو بھی لاؤں گی۔''

اس کے بعد اَچلا گاڑی تک چلی آئی۔ موہن جام رخصت ہوئے تو اَچلا اور موہن دونوں کی آنکھیں نم تھیں۔

اَچلا اتنی ہی تیزی سے اُوپر چلی آئی۔

رام گدکری کو اَچلا نے سوچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ بولتی چلی گئی۔۔۔''دیکھے میرے بھائی صاحب؟۔۔۔اچھے آدمی ہیں، لاکھوں میں ایک۔۔۔''

رام سر ہلاتا گیا۔۔۔حالانکہ اس کے ماتھے پہ تیور تھے۔ یہ بیچ میں خواہ مخواہ کا بھائی آٹپکا۔ اس کی ضرورت کیا تھی؟ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ جبھی تو اُس نے کہا۔۔۔''اگر سچ مچ تمہارا بھائی بہن کا رشتہ ہے، تو پھر بھائی صاحب کیوں کہتی ہو۔۔۔بھیّا جی کیوں نہیں کہتیں؟''

''لو، یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟''

اور اَچلا بدستور موہن کے گُن گاتی گئی۔ کیسے وہ دیبی کے ساتھ سیر کر رہی تھی تو کچھ موالی پیچھے لگ گئے۔ اگر موہن جام وہاں نہ آجاتا تو جانے کیا ہوتا۔ اور اَچلا کو اس رشتے کی صحت اور صفائی جتانے کے لیے اور بھی بہت سے جھوٹ بولنے پڑے، جن کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ رشتہ بھگوان نے نہیں، انسان نے بنایا تھا۔۔۔

اس کے بعد ایک دوبار پھر موہن جام آیا اور اَچلا اسی طرح سے بے اختیار اور بے خود لپکی جھپکی۔ موہن جام کے چلے جانے کے بعد رام گدکری دیر تک خاموش بیٹھے رہے، حتّٰی کہ اپنی خاموشی انہیں خود ہی ناگوار سی محسوس ہونے لگی۔ سامنے طاق پہ ٹرانسسٹر پڑا ہوا تھا، جس کی سوئی گھماتے ہوئے رام نے اچّی سے کہا۔۔۔

"جانتی ہو ٹرانسسٹر کسے کہتے ہیں؟"

"یہی جو سامنے پڑا ہے۔"

"نہیں" رام نے خفگی اور کچھ مسکراہٹ کے ملے جُلے جذبات میں کہا۔۔۔ "سسٹر

بہن کو کہتے ہیں اور ٹرانسسٹر وہ بہن ہوتی ہے جو سگی نہ ہو، ایسے ہی بھاڑے میں لے کر بنائی ہو۔۔۔اسی لیے تم شور بھی مچاتی ہو۔"

اَچلا کو بہت غصّہ آیا۔۔۔"کیا مطلب؟۔۔۔ آپ بہن اور بھائی کے رشتے پہ شک کرتے ہیں؟اس کا مذاق اُڑاتے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے۔۔۔"

"میں سب جانتی ہوں" اچّی نے ہانپتے ہوئے کہا "تم مرد لوگ سب کمینے ہو، تمہاری نظروں میں کوٹ کوٹ کر غلاظت بھری ہے۔۔۔ کیا دنیا میں مرد عورت، پتی پتنی بن کر ہی مل سکتے ہیں۔ کیا سنسار میں۔۔۔" اور اچّی کا گلا بھر آیا۔ وہ روتی ہوئی کیبنٹ کے سامنے بھگوان کی تصویر کے پاس جا کر دو زانو ہو گئی اور دُہائی دینے لگی۔۔۔ "میں نے کوئی بھی پاپ کیا ہو بھگوان، تو میرے شریر میں کیڑے پڑیں۔ کوڑھ لگ جائے۔۔۔"

رام اب پچھتانے لگا تھا۔ پھر بھگوان کی سند تھی۔ اس نے پیچھے سے آکر اَچلا کو

دونوں کاندھوں سے پکڑ کر اُٹھایا، لیکن اَچلا نے اس زور سے جھٹک دیا کہ رام دیوار سے جالگا۔ سر پہ معمولی سی چوٹ بھی لگی۔ اَچلا اتنی تندرست تھی کہ رام گدکری ایسے اکہرے بدن والے آدمی کا اسے سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر وہ اندر جاکر، اپنے آپ کو بستر پر گرا کر زور زور سے رونے لگی۔

رام اب بہت پچھتا رہا تھا، اور آپ جانتے ہیں پچھتاتے ہوئے مرد کی کیا شکل ہوتی ہے؟ رام کی ساری شام اچّی کو منانے میں لگی۔ حالانکہ وہ برلا مُتوشری سبھا گھر میں ولایت حسین کی ستار سننے کے لیے جانے والا تھا اور اَچلا کے لیے ٹکٹ بھی خرید کر لایا تھا، جو اب اس نے حسین مگر غصیلی بیوی کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر وہ وہیں بستر پر پڑی گھر کی اس ستار کی کمر میں بازو ڈال کر اس کے تار درست کرنے لگا۔ چونکہ استاد آدمی نہ تھا، اس لیے ایک بھی سُر ٹھیک نہ نِکلا۔ آخر اس نے کہا بھی تو صرف اتنا۔۔۔ ”میں تم پہ اتنا سا بھی شک کروں، اچّے، تو گائے کھاؤں، میں تو صرف یہ کہتا ہوں، تمہارے اپنے بھائی بھی تو ہیں۔۔۔“

”کہاں ہیں؟“۔۔۔ اَچلا بولی۔۔۔ ”ایک کلکتہ میں بیٹھا ہے، دوسرا بجواڑے

میں۔"

"پچھواڑے میں بھائی کا ہونا ضروری ہے؟"

"ہاں، ضروری ہے" اپّی نے سر کو ایک فیصلہ کُن جھٹکا دیتے ہوئے کہا "کوئی تو ہو، تم سے پوچھنے والا۔۔۔" رام گد کری پھر بھی کچھ نہ سمجھا۔ بڑی مر گھلّی سی آواز میں اس نے کہا۔۔۔ "تمہاری مرضی، لیکن میں تو سمجھتا ہوں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

تمہیں مونچھیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مہینے ڈیڑھ کے بعد سومترا چلی آئی۔

سومترا، پہلے سے واقعی اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ بچے کی بھی صحت پہلے سے اچھی تھی۔ وہ کاشمیری زبان کے چند لفظ سیکھ آیا تھا، جسے جا اور بے جا طور استعمال کرتا رہتا تھا۔ سومترا بار بار اسے پکڑ کر کہتی۔۔۔ ڈیڈی کو یہ سناؤ، ڈیڈی کو وہ سناؤ۔ لیکن وہ بدمعاش وہی رٹے ہوئے فِقرے دُہراتا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کاشمیری

زبان کی گندی گالیاں تھیں۔

موہن جام نے اَچلا کی سی حماقت نہ کی۔ سومترا سے اَچلا کی ملاقات کروانے سے بہت پہلے اس نے کہہ دیا، اس نے ایک بہن بنائی ہے۔

سومترا سنتی رہی۔ اسے اپنے موہن پہ پورا بھروسا تھا؟ نہیں۔۔۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی، جو مرد کے لا اُبالی پن سے محبت کرتی ہیں اور یا ان کی صحت اس غایت درجے کی خراب ہوتی ہے کہ وہ محبت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتیں اور زندگی کو ہر حالت میں موت پر ترجیح دیتی ہوئی کچھ ایسے فقرے کہتی ہیں۔۔۔ ”جھک مارتے ہیں تو مارتے پھریں“ اور پھر۔۔۔ ”بھگوان کو جواب انہیں دینا ہے، مجھے تو نہیں دینا۔“

آخر رات کو چپکے میں ایسی آواز میں روتی ہیں، جو انہیں خود بھی سنائی نہیں دیتی۔

سومترا نے کہا بھی تو صرف اِتنا۔۔۔ ”ضرورت کیا تھی، تمہاری اپنی بہن جو تھی۔ اس پہ نچھاور کرو اپنا پیار۔۔۔ یا ایسی ہی کوئی پیار کی باڑھ آئی ہے؟“

”ہاں“ موہن نے قدرے دُرشتی سے کہا۔

سومترا دَب گئی، صحت تو خراب ہونا ہی تھی، ابھی سے کیوں شروع ہو؟ اس نے جواب کے سے انداز میں سوال کیا۔۔۔ ”رادھا کیسی ہے؟“

”میں تو اس سے ملا نہیں۔“

”ہائے رام۔۔۔ جب سے مَیں گئی ہوں، اپنی بہن سے بھی نہیں ملے؟“

”وقت نہیں ملا۔“

”اور وہ خود بھی نہیں آئے؟۔۔۔ رادھا اور کیلاش پتی؟“

”آئے تھے، تین چار بار۔۔۔ لیکن میں ہی گھر پہ نہ تھا۔“

سومترا کہنا چاہتی تھی۔۔۔ ملتے بھی کیسے؟ وہ تو سگی بہن تھی، بنائی ہوئی تھوڑی تھی؟ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کی صحت ابھی بہت اچھی نہ تھی۔

اور پھر موہن جام نے جو کہہ دیا۔۔۔ ”چوبیس کو رکھشا بندھن کا تیوہار ہے،

جاؤں گا اور مِل آؤں گا۔۔۔"

رکھشا بندھن کے دن موہن جام پاریل اپنی بہن رادھا کے ہاں پہنچا۔ ساتھ سومترا بھی تھی۔ رادھا یوں پَر پھیلا کر لپکی جیسے برسوں کے بعد ملی ہو۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور نہ موہن کو اپنے مرد ہونے کا پتہ تھا۔ اس نے رادھا کو گال سے چُوم لیا، پھر سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اور بہن کی آنکھوں سے شکایت کے آنسو پونچھے۔

کچھ دیر بعد رادھا بڑے مزے سے اُٹھی اور لکڑی کی جالی میں سے مٹھائی کی طشتری اُٹھالائی۔ پھر چوکی سامنے رکھ کر بھائی کو بٹھایا۔ اس کا منہ پورب کی طرف کیا۔ جاجُو، موہن کا بچّہ بھی ساتھ دوسری چوکی رکھ کر بیٹھ گیا۔ جیسے اشٹمی کا لینکڑا۔۔۔

"ارے!" رادھا نے جاجُو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔۔۔"پہلے تُو راکھی بندھوائے گا؟"

"ہاں!" جاجُو نے گھڑا سا سر ہلا دیا۔

"نہیں، پہلے میرے باندھو۔"

"ایسا ہی حکم چلانا ہے" رادھا پیار سے بولی "تو بھگوان سے کہہ، تجھے بھی ایک بہن لا دیں، چھوٹی سی، جو ہر سال راکھی باندھا کرے۔"

اور ایسا کہنے میں جاجو، موہن اور کیلاش پتی، تینوں نے سومترا کی طرف دیکھا، جس نے شرما کر مُنہ ساری میں چھُپا لیا۔

رادھا نے موہن بھیّا کی کلائی پہ سادہ سی مَولی کی راکھی باندھی۔ مُنہ میں میٹھے کا ایک ٹکڑا ڈالا۔ موہن نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور رادھا کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ رادھا نے اس کا نوٹ اپنی آنکھوں سے لگایا اور پرارتھنا کی۔۔۔ "یہ دن ہر بہن کے لیے آئے بھگوان!" اور اس کی آنکھوں میں پیار اور عقیدت کی نمی تھی۔

سومترا اور بچّے کو گھر چھوڑ کر، موہن جام اَچلا کے ہاں جانے کے لیے نکلا۔ وہ

سومترا کو بعد میں کبھی لے جانا چاہتا تھا، اس روز نہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ عورتیں کئی باتوں میں مردوں کو خواہ مخواہ روکتی رہتی ہیں۔۔۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، جیسے عورتوں کی بہت سی باتیں مردوں کی سمجھ میں نہیں آتیں، اسی طرح مردوں کی بعض باتیں عورتوں کے پلّے نہیں پڑتیں۔

موہن، بازار میں ایک کپڑے کی دُکان پہ گیا۔ بہت کچھ اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد اسے بنارس کی ایک ساری ملی جس پہ ہلکی ہلکی زردوزی کی گئی تھی۔ اس پہ بھی اس کی قیمت سوا تین سو روپے طے ہوئی۔ موہن نے پیسے دیے۔ ساری کو ایک خوبصورت سے گفٹ پیپر میں بندھوایا اور کازوے پر کے ستیہ سدن کے لیے چل نکلا۔

اَچلا اپنے گھر میں بیٹھی قینچی ہاتھ میں لیے کتر بیونت کر رہی تھی، جو صبح ہی سے ختم نہ ہوئی تھی۔ رام گدکری کھڑکی میں کھڑا یونہی بازار میں لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور نیچے ٹیلر ماسٹر کی دُکان پہ آتے جاتے ہر آدمی کے سر پہ اپنے سگریٹ کا گل جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبھی سامنے موہن جام کی کار آ کر رُکی۔

پیچھے ہٹتے ہوئے رام گدکری نے آواز دی۔۔۔ ”اپّی۔“

”جی۔“ اپّی نے بڑی مٹھاس سے جواب دیا۔

”وہ آیا ہے۔“

”کون وہ۔۔۔؟ بھیّا جی؟۔۔۔“

”بھیّا جی نہیں۔۔۔ مچلا۔“

”مچلا؟“

”ہاں۔۔۔ تُو اَچلا ہے نا اور وہ مچلا۔۔۔۔“

جب تک موہن دروازے پہ آ چکا تھا، گھنٹی بجا چکا تھا، روزی دروازہ کھول چکی تھی۔

رام گدکری کا خیال تھا کہ موہن اس دن نہیں آئے گا۔ اگر وہ راکھی بندھوانے کے لیے آ گیا تو پھر وہ کوئی گڑبڑ نہیں کر سکتا۔ پھر تو سب ٹھیک ہے اور موہن آ گیا

تھا، جس کے لیے اپّی صبح ہی سے کلابتوں اور جھل مل اور نہ جانے کن کن چیزوں سے ایک خوبصورت راکھی بناتی رہی تھی۔ رادھا کی غریبانہ، مولی کی راکھی تو موہن نے اُتار کر کہیں پھینک دی تھی اور اب۔۔۔ اس کی کلائی پہ کچھ بھی نہ تھا۔ موہن کے آتے ہی اَچلا ہمیشہ کی طرح بوکھلا کر اُٹھی اور بھاگ کر ڈرائینگ روم میں چلی آئی اور اس کی یوں آؤ بھگت کی جیسے کوئی راجا کی کرتا ہے۔

رام گدکری ہمیشہ کی طرح سمجھ رہا تھا اور نہیں بھی سمجھ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں موہن جام پورپ کی طرف مُنہ کیے پیڑھی پہ بیٹھا تھا اور گدکری کچھ پرے بے اعتنائی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

جبھی اَچلا آئی۔ وہ بہت چُست قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں پیاز کے چھلکے کی طرح کا ایک دوپٹّہ تھا جس نے اپّی کے گلے اور سینے کو صحت کا رنگ دے دیا تھا۔ قمیص نے چھاتی، کمر اور نچلے حصّے کی بہت ہی خوبصورت حد بندیاں کر رکھی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں تھالی تھی، جس پہ رکھی ہوئی مٹھائی پہ سونے کے

ورق کانپ رہے تھے اور اس کے ایک طرف راکھی تھی، جس کی جھل مل میں کچھ سچّے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔۔۔

موہن نے بڑی ہمّت سے ہاتھ بڑھایا۔ اَچلا نے جب موہن کی کلائی پہ راکھی باندھنا شروع کی، تو رام گدکری کو اس کے ہاتھ خوشی سے کانپتے ہوئے دکھائی دیے۔ پھر موہن نے مٹھائی کے ٹکڑے کے لیے مُنہ کھولا اور اَچلا نے اس میں قلاقند رکھ دی۔ جبھی موہن نے گفٹ پیپر کھولا اور اس میں سے ساری نکالی، اس پہ سو روپے کا نوٹ رکھا اور دونوں چیزیں اَچلا کی طرف بڑھا دیں۔

رام گدکری کی آنکھیں تھوڑی دیر کے لیے پھیلیں اور پھر معمول کی سی ہو گئیں۔

رکھشا کی یہ رسم ادا کرنے میں اَچلا بھی خاموش تھی اور موہن بھی۔ دونوں کے بدن میں ایکا ایکی کہیں ہاتھ چھو جانے سے ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ پھر اَچلا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"یہ دن بار بار آئے بھگوان"۔۔۔ اور جب موہن نے اَچلا کی آنکھوں میں دیکھا، تو ان میں حیا کی سُرخی تھی۔۔۔

کچھ دیر بعد یونہی سی گفتگو کے بعد موہن نے رام گدکری سے ہاتھ ملایا۔ اَچلا سے نمستے کی اور چل دیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ایک آہ بھری اور چل دیا۔

اَچلا ہمیشہ کی طرح اسے نیچے چھوڑنے کے لیے جانا چاہتی تھی، لیکن آج۔۔۔ اس کے پیر جواب دے گئے تھے۔

"تمہیں خوش ہونا چاہیے، اچّی" رام نے کہا۔۔۔ بھائی کی راکھی باندھی ہے۔"

"ہاں!" اچّی نے کہا۔۔۔ "پر آج صبح ہی سے میری طبیعت کچھ۔۔۔"

"صبح ہی سے تو یہ سب بناتی رہی ہو۔ اکٹھا کرتی رہی ہو۔"

اَچلا نے سر ہلا دیا۔ رام نے آگے بڑھ کر کہا۔۔۔ "میں تو سمجھتا تھا تم اپنے بھائی کی

دی ہوئی ساری پہن کر مجھے دکھاؤ گی۔"

اپّی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں بند سی ہوتے دیکھ کر رام گدکری نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور بڑے پیار سے بولا۔۔۔ "کیا ہو گیا میری اپّی کو؟"

"کچھ نہیں" اپّی نے ایک دِھیمی سی آواز میں کہا اور پھر اپنا بازو رام کے گرد ڈالتے ہوئے بولی۔۔۔ "مجھ سے پیار کرو۔"

رام نے اپّی کو سینے سے لپٹا لیا اور بھینچنے لگا۔

"اور"۔۔۔ اپّی نے کہا۔

اس کے بعد اپّی کی آنکھیں بند تھیں، اور مُنہ کھلا ہوا۔۔۔ جب تک موہن جام، اَچلا اور رام گدکری کے خیالوں سے بھی پرے جا چکا تھا۔۔۔

حجّام الہ آباد کے

میں جہاں ڈائیک پر کھڑا ہوں، یہاں سے نظارہ بہت خوبصورت ہے۔۔۔ یہ گدلی گنگا، وہ نیلی جمنا، اور بیچ میں کہیں سرسوتی مائی ہے، جو آج تک کسی کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم ان تینوں دریاؤں کو تربینی کہتے ہیں اور جی میں آئے تو ان کے ملاپ کی وجہ سے اسے سنگم بھی کہہ ڈالتے ہیں۔ مُوڈ مُوڈ کی بات ہے۔۔۔

یہ سنگم یُوں تو اور بھی بہت سے کام آتا ہے، لیکن کسی مرے ہوئے لیڈر کی ہڈیاں بہانے کے لیے بہت ہی اچھا ہے۔ یہ قلعہ جو آپ دیکھ رہے ہیں، مغل شہنشاہ اکبر

نے بنوایا تھا۔ اس کی نگاہ کتنی دُور رس تھی۔ گویا وہ صدیوں پہلے جانتا تھا کہ چین کی طرف سے حملہ ہو گا تو یہاں پہنچتے پہنچتے تو رُک ہی جائے گا۔ کچھ دریا روک لیں گے، رہاسہا یہ قلعہ روک لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جمنا کا پانی آج تک اس قلعہ کے پیر دھو دھو کر پیتا ہے۔۔۔

پیچھے الہ آباد کا شہر ہے۔ نہ معلوم اسے کس فقیر کی دعا لگ گئی کہ ہر سال گنگا اور جمنا میں باڑھ آنے پر بھی یہ نہیں ڈوبتا۔ دارا گنج کے آس پاس کچھ جھونپڑیاں، کچھ کچّے مکان ہیں، جن کی بَلّی دے کر یہ پھر سے اپنے پانو پر کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے کوئی زچّہ چھٹی نہا کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ آج شہر پر کوئی دُھند سی چھائی ہے، یا شاید لوگوں کی آہوں کا دھواں ہے، فضا کی سرد مہری جسے اوپر نہیں اُٹھنے دیتی۔ نیچے زمین روکتی ہے، اوپر آسمان ٹوکتا ہے، لوگ بڑی خوشی سے گھُٹ گھُٹ جانے والی ان آہوں کو پھر سے سانس بنا کر استعمال کرتے ہیں۔

دُور، بائیں طرف الہ آباد کا نیا اسٹیشن ہے جو کمبھ کے موقع پر آنے والے بیشمار یاتریوں کے لیے بنوایا گیا اور جس پر ہماری سرکار کے لاکھوں روپے لگے ہیں۔

کوئی ضروری نہیں، اس اسٹیشن پر صرف جاتری لوگ ہی اُتریں۔ ہم اور آپ بھی اُتر پڑیں تو کوئی نہیں روکتا۔ یہ لوک راج ہے نا۔۔۔ جسے سانجھی واد کی پوٹ لگی ہے۔ جیسے بھانگ کو سنکھیئے کی پوٹ لگادی جائے تو وہ اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارا یہ لوک راج اور بھی نشہ آور ہو گیا ہے۔۔۔ اسٹیشن کے پیچھے سول لائنز کا علاقہ ہے جسے بنا تو انگریز گیا، استعمال ہم کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ اس نے ایک گرجا بھی بنوایا جو بہت پکّا ہے۔ پچھلی صدی میں چھاؤنی کے جتنے انگریز افسر مرے، ان کی روحیں اب تک اس گرجے میں عبادت کرنے آتی ہیں اور خدا سے دُعا کرتی ہیں کہ انہیں بہشت کے عیش و آرام سے چھٹکارا دلوا کر، ایک بار پھر الہ آباد کی چھاؤنی میں بھیج دے۔۔۔ تو گویا ہر شام یہاں پُرانا الہ آبا، تیل میں سر بسائے، منہ کو گلوری میں دبائے، اس نئے موڈرن الہ آباد سے گلے ملنے چلا آتا ہے اور کافی یا وسکی پی کر، کسی مولوی کی طرح چوری کی مرغی بغل میں دبائے، کہیں بھی نکل جاتا ہے۔

میں۔۔۔ مجھے الہ آباد ہی کا سمجھو۔ یوں میں بیلہ ٹکئی کا رہنے والا ہوں، جو یہاں

سے پچاس ساٹھ میل پرے ایک چھوٹا سا گانو ہے۔ برسوں پہلے، ایک اہیر بُڈھے
نے بیٹھے بیٹھے منوں ہی سن بٹ ڈالی، سینکڑوں ہی روپے بنائے، لیکن سب کے
سب میری پڑھائی پر ڈبو دیے۔ خود تو اندھا ہو گیا، پر مجھے دِکھنے لگا۔ یہ کالا اچھر،
جو ہمارے دیس کے بہت سے لوگوں کو بھینس برابر معلوم ہوتا ہے، مجھے بھُوری
پڑیا نظر آتا ہے۔

میں، اس اُلٹی طرف بمرولی کے ہوائی اڈے پر کلرکی کرتا ہوں۔۔۔ دس بجے
مجھے دفتر پہنچنا ہے۔ لیٹ ہو گیا تو میرا اسیکشن انچارج بہت خفا ہو گا۔ وہ بے حد
نروس آدمی ہے اور بلڈ پریشر کا مریض۔ مجھے اپنا تو کچھ نہیں، البتہ مجھے گالی دیتے
ہوئے وہ کانپا، منھ پر جھاگ لایا، اور گر گیا، تو پھر۔۔۔ میرا کیا ہو گا؟ لیکن،
خیر۔۔۔ کوئی بات نہیں، ابھی بہت ٹائم ہے۔ پھر حجّام لوک پتی کے گاہک بھی
دھیرے دھیرے کم ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔

ہاں تو، وہاں بمرولی کے ہوائی اڈے پر جب میں آفس کے کیبن میں بیٹھتا ہوں تو
کھڑکی سے مجھے ہوائی جہاز اترتے چڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ رَن وے چھوٹا ہونے

کی وجہ سے بڑا جیٹ ہوائی جہاز تو کوئی نہیں آتا، البتہ چھوٹے چھوٹے، بھنبٹ سے بیسیوں آتے ہیں۔ جیسے سیل چڑھے غسل خانے میں ریت مکھی اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے، ایسے ہی یہ جہاز ایکا ایکی آسمان کے کسی کونے سے ٹپک پڑتے ہیں۔ اگرچہ وہ سب چھوٹے ہیں، لیکن آدمی ان میں سے بڑے اترتے ہیں۔ کبھی کبھی سانپوں، رسّہ اچھالنے والے مداریوں، ہاتھیوں، راجاؤں مہاراجاؤں اور ننگا سادھوؤں کی تلاش میں باہر سے ٹورسٹ بھی آجاتے ہیں اور ہمیں اتنا سکھی دیکھ کر بڑے دُکھی ہوتے ہیں۔ بس، میرا تعلق باہر کی دُنیا سے صرف اتنا ہی ہے اور یا پھر میں اخبار "لیڈر" پڑھ ڈالتا ہوں۔

اب لوک پتی زیادتی کر رہا ہے۔ دیکھیے مجھے اَدھ مُنڈا چھوڑ کر اس نے ایک اور گاہک کو پکڑ لیا۔ میں اس کی طرف نظروں کے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہتا ہوں۔

"دَیا کرو، لوک پتی!۔۔۔ میری حالت پر ترس کھاؤ۔"

"ابھی لو، ببوا" لوک پتی کہتا ہے۔ "ابھی پٹ سے سب صفاچٹ ہوا جاتا ہے" اور اپنے استرے سے وہ گاہک کے چہرے پر دو ایک خوبصورت سے خط بنا دیتا ہے۔

جبھی وہ ایک اور گاہک کو پکڑ لیتا ہے جو میری طرح چلّاتا ہے۔۔۔

"مجھے دفتر جانا ہے۔"

"سبھوں کو جانا، ببوا، سبھوں کو جانا ہے۔"

اور لوک پتی کی آوازیں ہار سے ملی جُلی، ایک فلسفیانہ سی جیت ہے، جس کی بنیاد ہمارے صدیوں کے پُرانے گرنتھوں اور شاستروں پر قائم ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اس وقت وہ میرے دفتر کی نہیں، بھگوان کے گھر کی بات کر رہا ہے، مر کر جہاں ۔۔۔ سبھوں کو جانا ہے!

سوا آٹھ ہو گئے۔۔۔ زندگی بیتی جا رہی ہے، دفتر بیتا جا رہا ہے۔۔۔ یہاں سے گھر، گھر سے دفتر، دفتر سے شمشان۔۔۔ بیچ میں ازل ہی سے تھکی ہاری بیوی سے جھپٹ۔۔۔ مار کے بجائے کھانا کھانا۔۔۔ کھانا بھی وہ جو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کھا، نہ کھا، نہ۔۔۔ سوائے گود کے بچّے کے باقی کے سب یا تو اسکول جا چکے ہوں گے اور یا باہر مٹی میں رُل رہے ہوں گے۔ میں تو کہتا ہوں رُل ہی جائیں تو اچھا ہے

۔۔۔ ارے ہاں! ایک بات تو آپ کو بتائی ہی نہیں۔ میں جواہر نگر میں رہتا ہوں، جسے بنے بہت عرصہ نہیں ہوا۔ اس لیے سارے کا سارا نگر دُھول اور مٹّی سے اَٹا ہے۔ میں مٹّی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ایک تو اس لیے کہ میرا اور آپ کا، سب کا خمیر مٹّی سے اُٹھایا گیا ہے، اور دوسرے اس لیے کہ جب تک کسی بچّے کو مٹّی کا چُمبن نہ ملے، وہ پنپتا ہی نہیں۔ بیس بیس روپیہ پانے والے، ٹیوشنوں پر جینے والے اسکول کے ٹیچر اس بات کے مہتو کو کیا سمجھیں؟ ذرا کسی بچّے کے کپڑوں پر مٹّی دیکھی، اُلٹا ماں کے پاس بھیج دیا، جو پہلے ہی گربھ وتی ہے۔ عورتوں کی زبان میں ''اُس کی وہ تو پاجامے سے بھی چھُو جائے، تو پیٹ ہو جاتا ہے۔''

نیچے ڈائیک بھی بھُربھُری ہے یا شاید دفتر سے لیٹ ہو جانے کا ڈر ہے جس کے کارن زمین پانو تلے سے سرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں پہلے، کمبھ کے میلے پہ جو سینکڑوں ہزاروں لوگ اسٹیم پیڈ میں دَب گئے تھے، ان میں سے کوئی بچ گیا اور اب منوں مِٹّی کو سر پر سے ہٹاتے ہوئے، باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سن رہے ہو؟۔۔۔ معلوم نہیں ہوتا جیسے دُور، نیچے سے ایک

کورس کی آواز آ رہی ہے "آہستہ چل، ہو سکے تو چل ہی مت ---۔ تیرے قدموں کے نیچے ہزار جانیں ہیں---"

لوگ جیسے پاتال سے نکلنے کا جتن کر رہے ہیں۔ قلعے کے اندر، جہاں اُوپر بندر ہیں، نیچے مندر ہیں، کوئی کرشن جی کا، کوئی مہابیر جی کا اور کوئی کالی مائی کا۔ وہ سب قلعے میں، زمین کے نیچے کچھ یوں دبے ہوئے ہیں کہ ان کے اندر جانے سے بھی ڈر آتا ہے۔ لیکن اگر انسان آسمان کو تھگلی لگا سکتا ہے، چاند ستارے سے گلے مل سکتا ہے، تو کیا نیچے پاتال تک ہی نہیں پہنچ سکتا؟ اس گائے کے سینگوں کو نہیں چھو سکتا، جو صدیوں سے ہماری اس دھرتی کا بوجھ اُٹھائے کھڑی ہے اور وہ بھی ایک سینگ پر؟ جس کے کارن ہماری زمین سورج کے گرد ٹیڑھی گھومتی ہے اور بیکار کے موسم بناتی رہتی ہے۔ آج پوس پڑ رہی ہے۔ کل جھُلس دینے والی لُو چل رہی ہے---۔ ابھی بارش سے برباد ہو رہے، پھر اوڑ لگنے سے مر رہے ہیں---۔ اب کے جو لوگ پاتال سے آئے ہیں، عجیب سی خبر لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے، گائے بس سینگ بدلنے ہی والی ہے جس سے ساری دُنیا ہل جائے گی۔ سب تہس نہس

ہو جائے گا۔۔۔ نیچے کا اوپر، اوپر کا نیچے، دائیں کا بائیں۔۔۔ دیر تک زمین کانپتی رہے گی اور آخر تھم جائے گی اور صدیوں تک تھمی رہے گی۔ پھر گائے اسی وقت سینگ بدلے گی جب سائنس اتنی ترقی کر جائے گی کہ ہل دھرتی پہ چلنے کے بجائے، دھرتی ہل پہ چلنے لگے گی۔ عورت کے پیٹ میں خالی ہوا رہ جائے گی اور مرد کے پیٹ میں بچّہ —

لوک پتی کا نیا گاہک چلّا رہا ہے۔ بات یہ ہے، اس نئے گاہک کی حجامت شروع کر کے، اس کے چہرے پر تین چار خوبصورت سے خط لگا کر، لوک پتی نے اس غریب کو بھی بیچ ہی میں چھوڑ دیا ہے، اور ایک نئے گاہک کو پکڑ لیا ہے۔ اب وہ پہلا گاہک لوک پتی سے لڑ رہا ہے، اسے گالی دے رہا ہے۔۔۔ ارے! یہ کیا ہوا؟ دُہائی لاٹ صاحب کی۔۔۔ وہ پہلا گاہک چپکے سے چل دیا۔ وہ۔۔۔ میری طرف آ رہا ہے!

میں۔۔۔ اسے جانتا ہوں۔۔۔

"اُگر؟۔۔۔اُگر سین۔۔۔"

"ہاں، جل توری!۔۔۔تو یہاں کیسے؟" وہ مجھے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔۔۔یوں میرا نام بدھان چند ہے، لیکن میرے ویجیٹیرئن ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ مجھے جل توری ہی کہہ کر پکارتا ہے اور میں بھی اسے نہیں بتاتا کہ جل توری اصل میں مچھلی کو کہتے ہیں، جو مانس سے بنی ہوتی ہے۔ اگر روہو اور کتلا ہو تو اس میں پھر نام کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے، اور اگر کہیں میری طرح کی ٹراوٹ ہو تو ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہی نہیں۔ پھر مجھے جل توری پُکارنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پچھلے چناؤ میں میں نے کانگریس کو ووٹ دیا تھا۔ آج تو وہ لوک پتی پہ خفا تھا، ورنہ ہمیشہ وہ مجھے ماں بہن کی یہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتا ہے، میرا بڑا اِمتّر ہے!

میں کہتا ہوں۔۔۔ "بھائی میں تو اشنان کرنے آیا تھا، سوچا حجامت ہی کیوں نہ بنوا تا جاؤں؟ اپنا اُسترا ذرا کند ہو گیا۔۔۔ کوئی سِلّی ہی نہیں ملتی، اسے لگانے، تیز کرنے کے لیے۔"

”تم بھی سیفٹی استعمال نہیں کرتے؟“ اُگر مجھ سے پوچھتا ہے۔

”آں ہاں۔۔۔“ میں کہتا ہوں۔ ”سیفٹی کے ساتھ مزا نہیں آتا۔“

”تُف“ اُگر سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے۔ ”یہ ہم ایسے ان سائنٹیفک لوگوں ہی کی وجہ سے ہے جو اِدھر بیویوں کو اور اُدھر دیس بھر کو مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ کی دن دُونی رات چوگنی، ترقی ہوتی جا رہی ہے۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“

”تمھارے اور میرے جیسے لوگوں کو تو خصّی کر دینا چاہیے۔۔۔ اس سے تو اچھّا ہے، حجامت کے لیے وہاں، سیلون چلے جایا کرو۔“

”نہ بھیّا“ میں کہتا ہوں ”سیلون مہنگا پڑتا ہے۔ گھر ہی اچھا ہے۔ تُو آج اُن کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟“

”کیا بتاؤں یار؟“ اُگر داڑھی کے ان کٹے حصّے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے۔۔۔

”موٗناتھ سے میرے موٗسا دیناناتھ آئے تھے۔ کہنے لگے سنگم پر نہائیں گے۔ میں نے کہا ”نہایئے، میرا کیا جاتا ہے؟ جب تک میں حجامت بنوالوں گا۔۔۔ اور یُوں میں ان کمینوں کے چکر میں پھنس گیا۔“

اور میں اُگر سین کی طرف دیکھ کر ہنستا ہوں۔ لوک پتی نے اس کے چہرے پر کیا خوبصورت ڈاک بنگلہ بنا دیا ہے۔ یعنی کہ مکان بھی ہے اور لان بھی ہے۔ ایک طرف سفیدی، دوسری طرف سیاہی۔۔۔ معلوم ہوتا ہے، اپنے ہی ساتھ منہ کالا کیا ہے۔۔۔ اور پھر یکایک میری ہنسی بند ہو جاتی ہے۔۔۔ میں بھی تو ایسا ہی بُودم لگ رہا ہوں۔ اُگر سین کہیں منھ نہیں دکھا سکتا، تو میں بھی دفتر نہیں جا سکتا۔

ایک ہمدردی کی نظر سے اُگر سین کی طرف دیکھتے ہوئے میں اپنی بانہیں اس کے گِرد ڈال دیتا ہوں اور کہتا ہوں۔۔۔ ”کوئی بات نہیں، دوست! زندگی میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔“

”زندگی کی ایسی تیسی“ اُگر سین ایک دم آگ بگولا ہو کر کہتا ہے۔ بجائے اس بات

کے کہ اس کی تسلّی ہو، میری ہمدردی کے الفاظ اس کی جلتی پر تیل کا کام کر جاتے ہیں اور وہ گالیاں، جو اُگر مجھے دیا کرتا تھا، حجاّموں کو دینے لگتا ہے۔ ''اُن کی۔۔۔ ہر بات میں نفع خوری! اس نے پُورے مُلک کا بیڑا غرق کر دیا ہے'' اور پھر ایک اور گالی، پہلی سے ذرا چھوٹی عمر کی اور کنواری۔۔۔ مجھے بڑی جلن ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، میرے بجائے اس نے لوک پتی کو اپنا سالا بنالیا ہے۔

''سُنو اُگر۔'' میں پوچھتا ہوں ''تم کب سے اہنسا کے قائل ہو گئے؟''

''کیا کرتا؟''

''ارے لگاتے پکڑ کے اُسے، دو چار۔''

اور ایسا کرنے میں مَیں اپنا مُکّا زور سے ہَوا میں گھماتا ہوں۔ منہ میں گالیاں منمناتا ہوں، جو سب نامرد لوگ کرتے ہیں۔۔۔ ''کیوں تم نے اس کی پٹائی نہ کی؟''

''کیسے کرتا؟'' اُگر سین حجاموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے ''یہ سامنے کیبنٹ ہیں نا، ان میں جتنے بیٹھے ہیں، سب کے ہاتھ میں ایک ایک اُسترا ہے۔''

پھر ہم دونوں مل کر ہنستے ہیں، ایکا ایکی خفا ہو اُٹھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے لنڈورے منھ کی طرف دیکھ کر کِھل کِھلا اُٹھتے ہیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جیسے کیسے بھی ہیں، اپنے دیش کے نائی ہیں۔ ہمارے بیٹے بیٹیوں کا یہی رشتہ لانے والے ہیں۔ ہمیں ان سے سامنے کا جھگڑا نہیں مول لینا چاہیے۔ آخر تو اپنا گلا ان ہی کے ہاتھ میں آنا ہے۔

سنگم پر عورتیں نہا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کا بھی جسم اچھا نہیں۔ کسی کا پیٹ لٹکا ہوا ہے، تو کسی کی ٹانگیں اوپر اُٹھی ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے نیشنل بنک کا ٹیلر (Teller) ہے، جو اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا پبلک کے ساتھ بزنس کر رہا ہے۔ ایک بُڑھیا ہے، شہر کے گوالوں نے جس کی ممتا کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا اور بھرے بازار بیچ ڈالا۔ پیٹھ سے لگا ہوا اس کا پیٹ، سوکھی مرگھلّی ٹانگیں اور ٹھُنٹ سے بازو ہیں، جو دیکھنے میں اوپر اُٹھ کر سورج بھگوان کو انجلی ارپت کر رہے ہیں، لیکن اصل میں لپک لپک کر کیندری سرکار کے محکمے خوراک کی جان کو رو رہے ہیں۔ جیسے ہماری تصویر ''پاتھیر پنچالی'' بدیس پہنچی ہے اور وہاں کے لوگوں نے

بہت پسند کی ہے، اسی طرح باہر کے لوگ اس بُڑھیا کی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ فوٹو گرافی میں دُنیا کا سب سے بڑا انعام اسے ملے اور دُنیا بھر کے ملکوں سے غلّے کے جہاز کہیں اور جانے کے بجائے ہندوستان کی طرف پلٹ پڑیں۔۔۔ اچھی عورتیں ہمارے ملک میں کہاں رہ گئیں؟ وہ تو اب صرف کلینڈروں پر دکھائی دیتی ہیں، بشرطیکہ وہ بھی "لیڈر پریس" میں چھپے ہوں۔۔۔ ارے نہیں بھائی! اب بھی کہیں کوئی ایک آدھ دکھائی پڑ ہی جاتی ہے۔ وہ دیکھو سامنے۔۔۔ ایک نو عمر، نوخیز لڑکی بھی ہے۔ چلو ایک تو ہے جس نے صبح کے خالی منظر کو بھر دیا، اور رام دُھن کی یکساں اور تھکا دینے والی آواز مرتعش کر دی۔۔۔ وہ ساری سمیت نہا رہی ہے لیکن بے چاری، شرم کی ماری، ساڑھی کے بغیر بھی ہوتی تو نظر نہ آتی۔۔۔ پانی کی وجہ سے کپڑا اس کے بدن کے ساتھ چپک چپک جاتا ہے، ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی، جسے وہ بار بار اپنے آپ سے علاحدہ کرتی ہے۔ ہندستانیوں کی پُوری قوم کی طرح وہ اپنے جسم کو ناپاک اور نجس سمجھتی ہے اور اس غلط فہمی میں ہے کہ گنگا کا پانی اس کے عورت پنے کی گندگی اور میل کو دھو ڈالے گا، اس کے

جسم کو پاک کر دے گا۔ کوئی بھی پانی اس کے جسم کو پاک نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ پانی جس سے زندگی عبارت ہے، اس میں وہ کھُل کے نہا نہیں سکتی۔ اس میں نہائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے بھائیوں کو اس احساس سے کوئی نہیں نکال سکتا کہ وہ جی رہے ہیں تو کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ ان کے ذہن کی گہرائیوں میں یہ چیز بس چکی ہے کہ گائے کے دودھ پر صرف بچھڑے کا حق ہے اور وہ دودھ پیے بغیر نہیں رہ سکتے، بچھڑے کے ساتھ پاپ کیے بغیر کبھی نہیں رہ سکتے۔۔۔

۔۔۔ہا! یہ دُنیا دُکھ کا گھر ہے جس میں بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو کھا رہی ہے۔ سانس بھی لیتے ہیں تو ہزاروں کیڑے ہوا کے ساتھ اندر جاتے ہیں، ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی ذریعہ نہیں۔۔۔ پُران اور شاستر کا کوئی حوالہ نہیں جو اس سچ کو جھٹلا سکے کہ زندگی کا آدھار زندگی پر ہے؟ چلو، زندہ رہنے کے لیے اگر زندگی لینا ہی ضروری ہے تو کم سے کم تتوؤں کا ناش کیا جائے۔ مرد میں پانچ تتو ہوتے ہیں۔ ہوتے عورت میں بھی پانچ ہی ہیں، لیکن ہر دوسرے سال خاک اور خون میں لتھڑنے، بچّے پیدا کرنے، گھر بار میں اُلجھے رہنے کی وجہ سے آخر ساڑھے چار رہ

جاتے ہیں۔ گائے، گھوڑے اور بکری میں چار، مُرغی بٹیر میں تین، کیڑے مکوڑے میں دو، اور پھل سبزی میں ایک۔۔۔ اس لیے پھل اور سبزی ہی سے پیٹ کا نرک بھرنا اچھا۔ آخر ایک ہی تتو کا ناش ہوتا ہے نا۔۔۔

ارے، یاد آیا۔۔۔ مٹّی اگرچہ اُپجاؤ ہوتی ہے، اس پر بھی اس میں آدھا یا کوئی بھی تتو نہیں ہوتا۔ اس لیے مٹّی کھانی چاہیے۔ میں، بدھان چند، پرکھوں سے اچھا ہندو ہونے کے کارن کل سے مِٹّی ہی کا بھوجن کیا کروں گا۔

کشتی والے دھڑا دھڑ شر دھا مارے لوگوں کو بیچ منجدھار کے لے جا رہے ہیں، جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتے ہیں۔ پانڈے لوگ پُوجا کے پھُول ٹوکریوں میں لیے انہیں دے رہے ہیں اور مختلف بہانوں سے پیسے بٹور رہے ہیں۔ ہاں، پھُول زمین پر تھوڑے اُگتے ہیں؟ وہ زمانہ گیا جب کمل اپنے آپ کِھل جایا کرتے تھے اور دھرتی کا اُلہاس اُوپر چلا آتا تھا۔ اور اس کی چھاتیوں پر موتیا اور کرنے اور مروا کے ساتھ چنبیلی، گلاب اور صدبرگ کے نقش و نگار بنا دیا کرتا تھا۔

یہ لیجیے نو بج گئے۔۔۔ اب ہم زچ ہونے لگے ہیں۔

مَیں اور اُگر سین دونوں ٹہلتے ہوئے لوک پتی کی طرف جانے لگتے ہیں۔ جبھی لوک پتی کا چوتھا گاہک بھی اپنی طرف آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ میں اسے نہیں جانتا، لیکن شکل ہی سے وہ اپنی برادری کا جان پڑتا ہے۔۔۔ ویسے ہی آدھا مُنڈا ہوا، ویسے ہی دو چار خط چہرے کے بائیں طرف لگے ہوئے۔۔۔ میں ذرا ہمّت کر کے آگے بڑھتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں۔۔۔

"کیوں بھیّا، کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے" وہ کچھ جھینپ کر کہتا ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یہی۔۔۔ دُنیا کے رنگ۔"

اور پھر وہ داڑھی کے ان کٹے حصّے پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہم

تینوں ہنس رہے ہیں اور پھر ایکا ایکی تینوں ہی خفا ہو اُٹھے ہیں۔ میں اُگر سے کہتا ہوں۔ "یہ ٹھیک ہے، لوک پتی کے ہاتھ میں اُسترا ہے۔ لیکن اگر ہم چاروں مل کر اس پر جھپٹ پڑیں تو وہ ہماری داڑھی صاف کرے یا نہ کرے، ہم ضرور اس کی طبیعت صاف کر سکتے ہیں۔"

"اُگر شک و شبہے کی نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ "چاروں مل کے؟" گویا کہ ہم چار کبھی مل ہی نہیں سکتے اور اگر مل گئے تو پھر ہم ہندوستانی نہیں، ضرور ہم میں سے کسی کی رگوں میں بدیشی خون دوڑ رہا ہے۔ اگر مجھے دفتر نہ جانا ہوتا تو بھائی میں تو ضرور ان کے ساتھ مل جاتا۔ ہاں، یہ چوتھا بھائی ہمارا۔۔۔ خدا معلوم اس کی کیا آئیڈیالوجی ہے؟

ہمارا چوتھا بھائی ہنکارنے لگتا ہے۔۔۔ وہ لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف زہر اُگلنے لگتا ہے۔۔۔ "یہ لُوٹ کھسوٹ، یہ نفع خوری غیر قانونی، غیر جمہوری ہے۔ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے، بغاوت کرنی چاہیے" اور پھر وہ دُور ہی سے حجّاموں کو دھمکیاں دینے لگتا ہے۔ جب وہ شروع ہوا تھا تو میں سمجھا اس کے

ہاتھ میں اُسترے سے بھی تیز کوئی ہتھیار ہو گا، جسے گھماتے ہوئے وہ زور سے للکارے گا۔ دنیا جہان کے اَن مُنڈے لوگوں کو اُکسا بھڑکا کر، اپنی مدد کے لیے آمادہ کر لے گا اور لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کا خون کر ڈالے گا۔ لیکن یہ جان کر دُکھ بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی کہ وہ بھی ہماری طرح پارلیمنٹری ڈیموکریسی کا قائل ہو گیا ہے، جہاں ہم تقریر کر کر کے ہار چکے ہیں، وہ نیا بھرتی ہونے کی وجہ سے ابھی تک جوش کے عالم میں چلّا رہا ہے۔ زمین سے چار چار فٹ اُوپر اُچھل رہا ہے اور جب اُچھلتا ہے تو کچھ آگے بڑھنے کی بجائے تھوڑا پیچھے ہٹ جاتا ہے۔۔۔

"یہ لوک پتی" وہ کہتا ہے۔ "کہیں باہر سے دو اچھّر تو پڑھ آیا ہے، اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے۔ دُنیا جہان کی بہو بیٹیوں سے آنکھیں لڑاتا پھرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے، اس کی بیوی اسٹیل والے ایک سیٹھ کے ساتھ راس رچائے رہتی ہے۔ لڑکی ایک سٹئی کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہے اور لڑکا چوا بازار کے کوٹھوں کا طواف کرتا ہے۔۔۔"

یہ چوتھا بھائی ہمارا یہاں کے سب حجّاموں کو جانتا ہے۔ سب کے کچّے چٹھے کھول کر ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اسی نے بتایا، ان میں تین چار اچھے جّحام تھے جو پوری حجامت بنانے کے قائل تھے، لیکن بد قسمتی سے وہ ایک ایک کر کے مر گئے اور یا باقیوں کے شور مچانے کی وجہ سے نکال دیے گئے۔ وہ سب لوک پتی کے دوست تھے، اور ان کی وجہ سے لوک پتی سب کچھ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی سوجھ بوجھ اچھی تھی، نیت صاف تھی، لیکن ان کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ مجبوراً اسے دوسروں کی حرکتوں پر خاموش رہنا پڑتا ہے۔ اور کبھی وہ خود بھی وہی کرنے لگتا ہے جو اس کے باقی جّحام ساتھی کرتے ہیں۔

ان حجّاموں کے علاوہ دوسرے جو ڈربوں سے باہر بیٹھے ہیں، اس کھیل کے قاعدے قانون سے واقف ہو چکے ہیں۔ الہٰ آباد شہر، جس کے نیچے کہیں سرسوتی بہتی ہے، کسی ایسے شخص کو جذب نہیں کر سکتا جو پڑھا لکھا نہ ہو۔ اگر اتفاق سے کوئی اَن پڑھ آ بھی جائے تو چند ہی دن میں وہ اتنا پڑھ جاتا ہے کہ یونیورسٹی کا کوئی بھی اچھّے سے اچھّا ودیارتھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ الہ آباد کے جّحام، آدمی

بڑے مزے کے ہیں۔ خوب دور کی سوچتے ہیں۔ لمبی چوڑی یوجنائیں بناتے ہیں، جن میں سے پوری ایک بھی نہیں کر پاتے۔ بس بھاشن دیتے ہیں۔ زبان کے معاملے میں رائے ضرور رکھتے ہیں، لیکن اسے عملی جامہ پہنانا تو ایک طرف ننگا بھی گھومنے نہیں دیتے۔ آپس میں مل کر کچھ سرگوشی سی کرتے رہتے ہیں۔۔۔ ان میں سے ایک شاعر ہے جس کا نام چندر بھان ہے اور جو دیوگؔ تخلّص کرتا ہے۔ ہندی کے چھند سے اُردُو کو عقل مند بناتا ہے۔ طبیعت اس قدر حاضر ہے کہ اپسرا کی بجائے، دیو بالک پسند کرتا ہے۔ جانتا ہے نا کہ عورت سے پیار تو ایک قدرتی بات ہے، لیکن مرد سے پیار سرو اُچ کلا۔۔۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے چندر بھان دیوگؔ نے بہت پی لی اور رویا کے عالم میں بہت رویا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ پیغمبر ہے۔ ہائے، دنیا نے نہیں سمجھا۔ میں نے کہا ۔۔۔ ”کوئی بات نہیں دیوگ جی۔ دنیا آج نہیں تو کل آپ کو سمجھ لے گی۔۔۔“ پھر مدہو مدیرا کے سب راز چندر بھان دیوگؔ پر کھُل گئے اور وہ نشے میں دُھت رہنے لگا۔ اب وہ جیون کے رنگ منچ پر آتا تو خوب ہی لڑکھڑاتا۔ لوگ اس کے

لڑکھڑانے کو بھی ابھنے کی ایک قسم سمجھتے، جسے ناچتے ناچتے اس کے باقی ساتھی تو رنگ منچ کے وِنگ میں گئے، سو گئے۔۔۔

چند ہی برسوں کی بات ہے الہ آباد کے ان حجّاموں میں پنجاب کا ایک حجّام آگیا۔ بس، پھر کیا تھا، سب لٹھ لے کر اس کی طرف دوڑے اور اسے نکال پھینکنے کی ترکیبیں لڑانے لگے۔ لیکن وہ بھی ایک ہی بدمعاش تھا۔ باقاعدہ سینہ تان کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اگر کسی نے ایک اُسترا نکالا تو اُس نے دو نکال لیے۔ باقی حجّام ڈر کر بیٹھ گئے اور سامنے ہو کر لڑنے کی بجائے نیتی کی باتیں کرنے لگے۔ وہ گھاگ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے اپنے کیبن کے پیچھے سے کچھ تختے نکال کر ایک کھڑکی بنالی اور اس پر ایک بورڈ لگا دیا۔۔۔ ''کوشک چیری ٹیبل، ہومیوپیتھک ڈسپنسری'' اور کچھ دوائی کی شیشیاں رکھ لیں۔۔۔ مدر ٹنکچر، چھ ایکس پوٹینسی، تیس، دوسو، ہزار، پچاس ہزار، لاکھ کی پوٹینسی۔ بس پھر کیا تھا۔ آس پاس کے غریب غربا، بنا پوٹینسی کے سب لوگ علاج کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ دوسرے حجّام لوگ بدکے۔ ایک میٹنگ کر کے انہوں نے اس کے خلاف فیصلہ کر لیا، لیکن

جب تک کوشک، کمیٹی کی حمایت حاصل کر چکا تھا۔ اس سے گرانٹ بھی لے چکا تھا۔ اب اسے وہاں سے کوئی نہ ہلا سکتا تھا۔ چنانچہ آج تک وہ وہاں بیٹھا، سب کی چھاتی پر مونگ دَل رہا ہے۔ چہ جائے کہ باقی حجّام اس کا کچھ بگاڑ سکیں، اپنے بھی بیٹوں بیٹیوں کے رشتے، نائی ہونے کے ناطے اس سے کرواتے ہیں۔

اس پر طُرّہ یہ کہ ان کے بیچ ایک حجّام بھی چلا آیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کا کاروبار کیا چلے گا جس کی اپنی شیو نہیں بنی ہے۔ لیکن صاحب، جو اندازہ سیانے کا ہوتا ہے، دیوانے کا نہیں ہوتا۔ اُلٹا اس کے پاس زیادہ گاہک آنے لگے۔ وہ جانتے تھے نا کہ بالوں کے بارے میں جتنا یہ جانتا ہے، کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ اگر اسے بالوں سے محبت ہوگی تو ایسی پیاری شیو بنائے گا کہ راہ چلتی لڑکی گال سے گال رگڑے گی اور نفرت ہوگی تو یوں کھونٹی سے اُکھاڑ پھینکے گا کہ سات جنم تک ٹھوڑی پہ بال اُگیں گے، نہ دماغ میں خیال پیدا ہوگا۔

یہ چوتھا بھائی ہمارا، سنگم کے نائیوں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن میں اُگر سین کو آنکھ مارتا ہوں اور کہتا ہوں۔۔۔ ”بھائی، میں تو چلا، ساڑھے

نو ہو گئے۔"

اُگر حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "ایسے ہی چل دو گے، جل توری؟" "کیا کروں؟" میں کہتا ہوں "گیا تو بیوی ہی چلی جائے گی نا، نوکری تو نہیں جائے گی؟"

اور حسرت کی نظر سے لوک پتی کو دیکھتے ہوئے چل دیتا ہوں، جس کے پاس ابھی تک گاہکوں کا تانتا بندھا ہے۔ میرے من میں یہ خیال چٹکی لیتا ہے کہ شاید لوک پتی اب بھی مجھے بلا لے اور اگلے پانچ منٹ میں نک سُک سے درست ہو کر جاؤں۔ لیکن صاحب، لوک پتی کو کہاں وقت ہے؟ اور میں رکشا لے کر گھر پہنچ جاتا ہوں۔۔۔

وڈّیا، میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہے۔

"ہائے جی، کیا ہوا" وہ چوکھٹ پر میری آہٹ سنتے ہوئے بول اُٹھتی ہے۔

"کیا ہوا کیا؟" میں پوچھتا ہوں۔

"کہاں بھانگ پی کے پڑ گئے؟"

میں کوئی جواب نہیں دیتا، لیکن وہ کہے جاتی ہے "اتنا بھی نہ سوچا، دفتر کا وقت ہو گیا۔ تمھیں تو بس کوئی باتیں کرنے کو مل جائے۔۔۔"

جبھی اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑتی ہے۔۔۔

"سیّاری!" وہ کہتی ہے "یہ کیا؟" اور پھر وہ دوپٹّہ منھ پر کرتے ہوئے ہنسنے لگتی ہے۔ پھر اس پہ بس نہیں۔ پڑوس میں آواز دیتی ہے۔ "جگن بھیّا۔" اے ذرا ان کو بھی دیکھنا" —

میں ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ "وِدّیا۔۔۔ بھگوان کے لیے۔۔۔"

اور پھر وہ خود ہی دیکھنے کے لیے ہاتھ میری داڑھی کی طرف بڑھاتی ہے۔

"خبر دار" میں اس کا ہاتھ جھٹکتے، خفا ہوتے ہوئے کہتا ہوں "تو ہاتھ لگائے گی تو میں لات لگاؤں گا۔"

اور پھر میں سوچتا ہوں۔۔۔ اس میں بیچاری وِدّیا کا کیا قصور؟ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے میں اسے صرف اتنا ہی کہتا ہوں "شکر کرو تم عورتوں کی حجامت کسی لوک پتی نے نہیں، ترلوک پتی نے بنائی ہے" اور ایسا کرنے میں مَیں اُوپر بھگوان کی طرف اشارا کرتا ہوں۔

"ہمیں اور تھوڑی مصیبتیں ہیں؟" وِدّیا کہتی ہے "تمھیں تو صرف ایک حجامت بنوانی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد وِدّیا کھانا نکالنے لگتی ہے۔ میں غصّے میں کہتا ہوں۔۔۔ "آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ ہاتھ ملتے ہوئے کہتی ہے "ہائے جی، کیا انرتھ ہے۔ گرے گدھے پر سے، اور غصّہ غریب کمہار پر نکال رہے ہو—؟"

پھر میں سوچتا ہوں۔۔۔ کھانے کے ساتھ میرا کیا جھگڑا؟۔۔۔ "اچھّا، لاؤ کھانا۔"

وِدّیا کھانا پروستی ہے۔ میں جلدی جلدی نوالے منھ میں ڈالتا ہوں، جو اُوپر سے

نیچے جانے کے بجائے، نیچے سے ۔۔۔ اُوپر جانے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میں کھانا نہیں کھا رہا، کھانا مجھے کھا رہا ہے۔ یا کوئی نیولی کرم کرنے بیٹھا ہوں۔ کھانا کھاتے ہوئے ہمدردی، محض ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وِدّیا کے سامنے اپنی آج کی مصیبت کی داستان دُہراتا ہوں۔ وہ بے چاری، بھولی بھالی نہیں سمجھتی کہ اس کے مُنہ سے نکلا ایک بھی ہمدردی کا لفظ مجھے کتنا دُکھ پہنچائے گا۔ میرے بیان کے آخر میں وہ کہہ اُٹھتی ہے۔

"ٹیکی پڑے ان نگوڑوں پر۔۔۔ آج دفتر مت جاؤ۔"

"کیوں؟"

"خواہ مخواہ کیوں تماشا بننا۔۔۔"

اس پر میں ایکا ایکی بھڑک اُٹھتا ہوں۔۔۔ کیا مطلب؟۔۔۔ میری شکل۔۔۔ میں اسے بھی تماشا دکھائی دے رہا ہوں؟ کم از کم اسے تو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں دفتر نہیں جا سکتا تو گھر بھی نہیں آ سکتا؟ اور میں وِدّیا کو گالیاں دینے لگتا ہوں، جو

دراصل مجھے سنگم کے نائیوں کو دینا چاہئیں تھیں، یا اپنے آپ کو۔ وِدّیا اندر چلی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں، مجھ سے ڈر گئی۔ لیکن وہ باہر آتی ہے تو ہاتھ میں ایک کٹوری لاتی ہے جس میں گرم پانی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں شیونگ اسٹک اور اُسترا۔ سیفٹی نہیں، وہی لوک پتی والا۔۔۔۔۔۔

میں سوچتا ہوں۔ چلو اُسترا کُند ہے تو کیا۔ ذرا زور سے لگاؤں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر بجائے اس کے کہ لوگ مجھ پر ہنسیں، میں اُن پر ہنسوں گا۔ چنانچہ جلدی جلدی چہرے پر جھاگ پیدا کر کے میں اُسترا پھیرنا شروع کرتا ہوں۔ لیکن صاحب، اُسترا ہے کہ کہیں بھی ٹکنے کی بجائے، اوپر سے یوں پھسلتا ہوا ٹھوڑی پر آجاتا ہے، جیسے پارک میں سلیپنگ روسٹرم سے بچے ایک دم پھسلتے ہوئے نیچے آرہتے ہیں۔۔۔ میں جھلّا کر پانی کی کٹوری نیچے پٹخ دیتا ہوں۔ اُسترا دُور پھینک دیتا ہوں۔

”کیا بکواس ہے“ میں ہنکارتا ہوں۔۔۔ ”ہ اُسترا لے کے دیا تھا۔۔۔ تیرے میکے والوں نے؟“

”ہائے جی“ وِدّیا کہتی ہے ”اُنھوں نے تو ٹھیک ہی لے کر دیا تھا۔ تم ہی نے سِلّی گُم کر دی۔“

”کس نے سِلّی گُم کر دی؟“

”تم نے۔۔۔ روز نکال بیٹھتے تھے۔“

”جھُوٹ!۔۔۔ معلوم ہوتا ہے تم اس سے اروی چھیلتی رہی ہو۔“

وِدّیا خفیف سی ہو کر اُسترا اُٹھا لیتی ہے۔ میں پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا ہوں، تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ دوپٹے کے پیچھے اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے اور جب میں اسے شدھ انگریزی کے لہجے میں ”شٹ اپ“ کہتا ہوں، تو معلوم ہوتا ہے غلطی سے ”بک اپ“ کہہ دیا۔ ایک قہقہہ پوری فضا کو بھر دیتا ہے اور وِدّیا اُسترے کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے مجھے دکھاتی ہے ”حجامت ہو بھی کیسے، اُلٹے ہی استرے سے اپنے آپ کو مُونڈتے رہے۔“

میں دیکھتا ہوں جلدی کے عالم میں مَیں سچ مچ اپنے منھ پر اُلٹا اُسترا پھیر تا رہا تھا۔

وِدّیا کہتی ہے ”خواہ مخواہ میرے مائیکے والوں کا نام بدّو کیا۔“

”اچھّا اچھّا“ میں جزِ بزِ ہو کر کہتا ہوں اور پھر اپنی پوری سبھِّتا، اپنے پورے کرم دھرم، اپنے اعتقادات پر تبرّے بھیجنے لگتا ہوں۔ وِدّیا بول اُٹھتی ہے ”خبر دار—! اس میں سنگم کا کیا قصور؟ گنگا میّا کا کیا دوش؟۔۔۔ میں تو کہتی ہوں۔ میں مروں تو مجھے جلانا مت۔ گنگا میں میرا جل پروا کر دینا۔۔۔“

اور میں یہی سوچتے ہوئے چل دیتا ہوں۔ گنگا میں جل پروا؟ کیسی مان مریادا ہے یہ؟ کیسا پاگل پن ہے ہماری پوری قوم کا؟ اور مجھے یاد آتا ہے وہ دن، جب میں دروپدی گھاٹ کی طرف گنگا میں نہانے نکل گیا تھا۔ سردی اور گرمی، بیچ کے دن تھے۔ گنگا میں جب باڑھ نہیں آئی تھی اور دریا منوں ہی بالو چھوڑ کر خود کناروں سے بہت دور چلا گیا تھا۔ مجھے دریاؤں اور چشموں کا بہت شوق ہے۔ باؤلے کُتّے کا کاٹا ہوا جتنا پانی کو دیکھ کر ڈرتا ہے، اتنا ہی میں پانی کے نظارے سے خوش ہوتا ہوں۔ پہلے کنارے کے پاس کی چکنی مٹی پیٹ پر ملتا ہوں، جس سے جسم کی بیماریاں تو کیا دِل اور دماغ کی بھی ساری اُلجھنوں جاتی رہتی ہیں۔ پھر اڈولف

جُسٹ کا سِٹز باتھ لیتا ہوں، جس میں اپنے بدن کے نہایت شرمناک حصّے کو پانی میں ڈبو کر ایک ہاتھ سے پانی پیٹ پر ڈالتا ہوں اور دوسرے سے پیٹ کو خوب ہی زور سے ملتا ہوں۔ اندر آنتیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ مرے ہوئے ٹِشو بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ پھر کنارے پر کھڑے ہو کر تولیے کی بجائے ہاتھ سے پورا جسم رگڑتا ہوں۔ روم روم جاگ اُٹھتا ہے اور بدن اسکول کی لڑکی کے بدن کی طرح، نرم اور چکنا ہو جاتا ہے۔ چونکہ ننگا ہوتا ہوں اور سب کی طرف دیکھتا بھی ہوں، اس لیے میری طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ بندر بھی گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ شاید سمجھتے ہیں کہ ہم سے بڑا کوئی آگیا۔ چنانچہ اس دن باتھ لینے کے لیے گیا تو کیا دیکھتا ہوں، ایک انسانی کھوپڑی پڑی ہے، جس کے ساتھ ریڑھ کی ہڈی لگی ہے۔ ضرور کسی وڈّیا کی بہن یا اس کے بھائی کا جل پروا ہوا ہو گا۔ مجھے اس کا اتنا نہیں لگا، جتنا اس بات کا کہ۔۔۔ ہائیں! ہم ہندستانیوں کے بھی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے!۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کسی اور قوم کا کوئی آکر یہاں ڈوب مرا ہو۔۔۔ مگر ایسا ہو تو دنیا جہان میں کہرام مچ جائے اور وہاں کے لوگ رِگ لگا کر پوری بالو کو چھان ماریں

اور اپنا مُردہ بھی یہاں سے نکال کر لے جائیں۔۔۔

اس کھوپڑی سے کچھ پرے ہو کر کنارے پر کپڑے رکھتے ہوئے میں پانی میں اُترا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ پاس ہی کے ایک اُجول اور پاون جل میں سچ مچ کا ایک مُردہ پڑا ہے۔ میں اُچھل کر باہر آگیا اور گھِن اور خوف سے کانپتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا، جس کا جل پروا ہوا تھا اور اب اِسے جل کی پروانہ تھی۔۔۔ اس کے بدن کا گوشت مچھلیاں کھا چکی تھیں۔ اگر میں بھُولتا نہیں، تو مُردے کے نُچے ہوئے چہرے پر ایک طرف داڑھی تھی اور دوسری طرف سب صفاچٹ تھا۔ آج کے تجربے سے میں اس بات کا اندازہ کرتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہ ضرور سنگم پر گیا ہو گا اور وہاں کے کسی لوک پتی، چندر بھان یا کوشِک سے حجامت بنوائی ہو گی! خیر میں اپنے کپڑے پکڑ کر دریا کے اوپر کی طرف ہو لیا، تاکہ اس نمازی مرد کے گھناؤنے بدن سے لگا ہوا پانی مجھ تک نہ آئے۔ ایک بار پھر کپڑے رکھ کر دریا میں اترا ہی تھا کہ پانی میں سے دو ٹانگیں باہر اُٹھتی ہوئی دِکھائی دیں۔ میں بھاگ آیا اور جب سے میں نے دروپدی گھاٹ تو کیا، کسی سیتا یا ساوتری گھاٹ پر بھی نہانے کا

ارادہ نہیں کیا۔۔۔اور یہ ودّیا، میری بیوی، ایک عجیب طرح کے پاگل پنے میں اپنا جل پرواکرنے کو کہہ رہی ہے۔۔۔نابابا!میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد بھی کسی کی ٹانگیں یوں پانی سے باہر اُٹھی ہوں۔

بازار جاتا ہوں تو وہاں ایک مسلمنٹے سے میری لڑائی ہونے لگتی ہے۔ایک پل میں یوں نظر آنے لگتا ہے، جیسے شہر بھر میں ہندو مسلم فساد ہو کر رہیں گے۔کشتوں کے پُشتے لگ جائیں گے۔یہ بات نہیں کہ وہ میری طرف دیکھ کر ہنس دیا۔اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی، البتہ وہ ایک شعر گنگنا رہا تھا۔

یہ عجب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

اس نے صرف ایک بار میری طرف دیکھا تھا اور میں نے سمجھا وہ شعر مجھ پر چپکا رہا ہے۔ میری آدھی منڈی ہوئی داڑھی کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ مگر جب کوئی مسلمان اللہ رسول کی قسمیں کھاتا ہے، تب تو ماننا ہی پڑتا ہے۔ یہ طے بات ہے

کہ وہ یوں ہی اپنے البیلے پن میں شعر پڑھ رہا ہو گا اور میں اپنی نرودھ کا شکار اسے غلط سمجھ گیا ہوں گا۔

میں دفتر پہنچتا ہوں۔۔۔ لیٹ!۔۔۔ اور چپکے سے اپنی سیٹ میں جا دبکتا ہوں۔ یوں کام میں لگ جاتا ہوں، جیسے صبح ہی سے مرنے کی فرصت نہیں اور قریب دو گھنٹے سے اس دفتری نزع کے عالم میں رہا ہوں۔ کلرک میری طرف دیکھتے ہیں۔ کھُل کے ہنستے ہیں اور بار بار میری عیادت کے لیے آتے ہیں۔ اس عرصے میں میرا سیکشن انچارج صرف ایک بار میرے پاس آتا ہے۔ میں بہت کچھ اپنا چہرہ اس سے چھپانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن جبھی لاگ بُک کے گُم ہو جانے میں جو ہنگامہ بپا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے، اپنے آپ کو بھُول کر مجھے اس کی طرف دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھتے ہی کہہ اُٹھتا ہے۔۔۔ ''آج تم سنگم پر گئے تھے؟''

''جی، سر'' میں جواب دیتا ہوں۔ اور میرا ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔ میں ڈرتا، لرزتا ہوں کہ نہ معلوم اب وہ مجھے کیا کہے گا؟ لیکن صاحب وہ

ایک ایسی بات کرتا ہے کہ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ اس بات سے میری داڑھی کا کیا تعلق؟ وہ کہتا ہے۔۔۔ ”کوئی بات نہیں۔۔۔ لاگ بُک کل مل جائے گی۔۔۔“۔۔۔ پھر وہ چلا جاتا ہے۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ چہرہ کانوں تک تمتما اُٹھتا ہے اور اس کے اَن منڈے حصّے پر ایکا ایکی عجیب سی خارش ہونے لگتی ہے۔ میں جتنا اسے کھجاتا ہوں، اُتنا ہی اوپر سے نیچے تک میری خارش بڑھتی جاتی ہے۔

میں کام کے بیچ سے اُٹھ کر، اپنا جی لگانے کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔ کچھ ٹورسٹ آتے ہیں، جو میری طرف بالکل نہیں دیکھتے۔ باہر کے لوگوں کا یہی ہوتا ہے نا، ہم ہندستانیوں کی طرح دوسرے کے پرائیویٹ معاملوں میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتے۔ ان میں سے ایک بنچ پر میرے پاس آبیٹھتا ہے اور اپنا ایئر بیگ نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ بظاہر ایک اُچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالتے، اپنا بیگ پکڑ کر اس میں سے آئینہ نکالتے ہوئے اپنا منہ دیکھنے لگتا ہے۔

میری سمجھ میں کچھ آتا ہے، کچھ نہیں آتا۔ اگر سویرے، بازار میں اس مسلمنٹے سے میری لڑائی نہ ہوتی تو شاید میں اس گورے کرسٹان سے بھی بھڑ جاتا۔ شاید میں اس لیے چُپ رہا کہ ان گوروں کا اب تک ہم پر بہت رعب ہے۔۔۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، اس کے آئینہ دیکھنے کا میری داڑھی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں اس کنفیوزڈ حالت میں اس کی طرف دیکھ کر اپنی ٹوٹی پھُوٹی انگریزی میں اس سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"ضرور۔۔۔ ضرور۔" وہ کہتا ہے۔ "میرا نام رچرڈ کینیڈی ہے۔"

اور پھر میرے پوچھے بنا وہ کہے جاتا ہے "میں امریکا سے آیا ہوں۔ ہار بر ویل کے شہر سے۔"

میں اپنے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا ہوں۔۔۔ سالا آیا بھی ہے تو ہار بر ویل سے!۔۔۔ یا شاید میری داڑھی کی طرف دیکھ کر اس نے کسی فرضی قصبے کا

نام لے لیا۔ بہر حال، میں پھر پوچھتا ہوں۔

"اس وقت آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بنارس سے۔۔۔ میں سارناتھ میں بُدھ کا ستُوپ دیکھنے گیا تھا" اور پھر وہ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے "وہاں سے گاڑی میں آیا ہوں اور اب جہاز کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ستُوپ اچھا لگا آپ کو؟"

"بہت" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے "لیکن معلوم ہوتا ہے انڈیا میں لوگ قدیم تاریخی چیزوں کو ٹھیک سے سنبھال کر نہیں رکھتے۔ دیکھو نا، اس کے ایک طرف خشک گھاس سی اُگی ہے۔۔۔"

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات پر ری ایکٹ کروں، لاؤڈ اسپیکر پر سے آواز آتی ہے۔۔۔ یُور اٹنشن پلیز۔۔۔ فلائٹ ٹو او تھری کے پسنجر۔۔۔"

رچرڈ اپنا بیگ لیے اُٹھتا ہے۔ وہ فقرہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے، جو مجھ سے رخصت ہوتے، ہاتھ ملاتے، مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں بیکار ہی سارناتھ گیا، ستُوپ دیکھنے کے لیے۔"

دفتر میں جیسے تیسے بھی دن کٹتا ہے، میں وقت سے پہلے ہی اُٹھ کر چل دیتا ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ چاہے میری پوری جائداد لگ جائے، سیلون میں جا کر حجامت بنواؤں گا، پھر کوئی دُنیا کا اور کام کروں گا۔ جبھی میں اپنے آپ کو یونیورسٹی ہیر کٹنگ سیلون کے سامنے پاتا ہوں جو گراؤنڈ ٹرنک روڈ پر ہونے کی بجائے، خُلد آباد کے ایک کونے میں ہے۔ سامنے اس نام کا بورڈ لگا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے۔۔۔ پروپرائٹر۔ ناصر حسین۔۔۔

اندر داخل ہوتے ہی میں ایک ایسی کرسی پر جا بیٹھتا ہوں، جس میں مجھے ماں کی گود کا سا سکون حاصل ہوتا ہے۔

ناصر حسین میرے پاس آتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ کا ٹوال میرے

گلے میں باندھ دے، وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ ''آپ شیعہ ہیں یا سُنّی؟''

''جی؟''۔۔۔میں حیران ہوتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں۔ ''آپ شیعہ مسلمان ہیں، یا سُنّی؟''

''کیوں بھائی؟'' میں کہتا ہوں ''حجامت کا شیعہ، سُنّی سے کیا تعلق؟''

''معاف کیجیے میں۔۔۔میں سُنّیوں کی حجامت نہیں بناتا۔''

''آپ شیعہ ہیں؟''

''ہاں''!

''تب تو اُلٹا آپ کو سُنّیوں کی خوب ہی حجامت بنانی چاہیے۔ ویسے میں ہندو شیعہ ہوں ——بدھان چند میرا نام ہے۔''

''او'' ناصر حسین کہتا ہے ''پھر ٹھیک ہے۔ مجھے صرف سُنّیوں سے نفرت ہے۔ ان سے تو ہندو ہی لاکھ درجہ اچھّے ہیں۔''

پھر وہ تولیہ میرے گلے میں ڈال دیتا ہے اور سنتا ہی نہیں کہ مجھے حجامت بنوانا ہے، بال نہیں کٹوانا۔ آخر اسے پتہ چل جاتا ہے اور وہ شیونگ بُرش لے کر میری طرف بڑھتا ہے۔ جبھی میرے چہرے کی طرف دیکھ کر وہ ایک دم رُک جاتا ہے!۔۔۔ پھر غور سے دیکھتا ہے اور شیونگ اسٹک کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے۔۔۔

"آپ اُٹھ جائیے۔"

"کیا مطلب؟" میں حجامت کو قریب آ کر دور ہٹتے ہوئے دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں۔۔۔ "کہانا، میں سُنّی نہیں۔"

"سُنّی وُنّی کی بات نہیں۔"

"بات یہ ہے تو پھر۔۔۔ کیا بات ہے؟"

"میں جو خوشی کے اس غبارے پر سوار تھا جو لکھنؤ میں پہلی بار کسی انگریز نے اُڑایا تھا، اس کے پنکچر ہو جانے سے ایک دم بھُووُوُوُ۔۔۔ کی آواز سے نیچے آ رہتا

ہوں۔ ناصر حسین کہتا ہے—

"کسی اور نے آپ کی شیو شروع کی تھی؟"

"ہاں!" میں کہتا ہوں "لوک پتی نے، سنگم پہ۔۔۔ گریٹ آدمی ہے۔"

"کچھ بھی ہو" ناصر حسین آواز میں ایک قطعیت پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے "کتنا بھی گریٹ ہو۔ لیکن بات یہ ہے۔۔۔ کسی کے بھی چہرے پہ، کوئی سا بھی حجّام، ایک بار کیسا بھی خط لگا دے، کوئی دُوسرا حجّام اسے ٹچ نہیں کر سکتا۔۔۔ یہ ہماری یونین کا قانون ہے۔"

"آپ کی یونین کی ایسی تیسی" میں ایک دم آگ بگولا ہو کر کہتا ہوں۔۔۔ "ایک طرف ہمارے حاکم ہیں" دوسری طرف کام گار، مزدور اور اُن کی یونین۔۔۔ بیچ میں ہم لٹک رہے ہیں۔۔۔ کیا آپ نے کسی بزرگ سے نہیں سُنا—مرو اور مَرنے دو؟ ہم جائیں تو کہاں جائیں؟"

"باہر" ناصر حسین کہتا ہے۔

میں ایک دم سب کچھ بھول کر پہلے باہر کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر اس بات کے معنی سمجھتا ہوں۔ مجھے اُمید ہی نہ تھی، یونیورسٹی ہیئر کٹنگ سیلون کا ناصر حسین آزادی کے بعد میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ ہوش میں آتے ہوئے، ناصر حسین سے کہتا ہوں۔ ''مَیں تمہاری یونین کے خلاف اسٹرائیک کرا دوں گا۔ بھُوک ہڑتال کر دوں گا۔۔۔ میں ۔۔۔ مَیں پنڈت جی تک پہنچوں گا جو یہاں کے رہنے والے ہیں۔ اپنے وطنی ہیں۔ الہ آباد میں ایک بار آنے دیجیے انہیں۔ میں انہیں کہوں گا۔۔۔ ''پنڈت جی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ابھی تک، اس عمر میں آپ نے دیش کا معاملہ ٹھیک نہ کیا تو بڑے ہو کر کیا کریں گے؟''

اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا، تو میں ناصر حسین کے حضور میں گِڑگِڑانے لگتا ہوں۔۔۔ ''ناصر جی! آپ مجھ سے سو روپے۔۔۔ دس بیس روپے لے لیجیے لیکن بھگوان۔۔۔ نہیں نہیں، اللہ کے لیے ایک بار میری حجامت بنا دیجیے۔ نہیں میں دنیا جہان میں کہیں مُنہ دِکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔۔۔ سب مجھ پر ہنس رہے ہیں۔۔۔ ایک میں رو رہا ہوں۔''

بجائے اس کے کہ ناصر حسین میری حالت پر رحم کھائے، وہ کہتا ہے ”رات ہو گئی، اس وقت کون مُنہ دیکھتا ہے؟“

بیکار ہے۔ سب کچھ بیکار ہے۔ چنانچہ میں کوئی فرضی چھڑی اُٹھا کر، فرضی ہوا میں اسے گھُماتا ہوا، کسی فرضی گھر کی طرف چل دیتا ہوں۔۔۔

رات بھر وِڈّیا، میری بیوی پاس نہیں آتی۔ مجھے یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کوئی کبوتر ہوں جسے کسی نے لال رنگ لگا دیا، یا چڑا ہوں جس کے گلے میں کسی نے پھُندنا باندھ دیا، اور اب میرے ہی عزیز مجھے اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتے۔ چونچیں مار مار کر لہولہان کر رہے ہیں، کاٹ کاٹ کر بھگا دینے کی کوشش میں ہیں۔

تڑکے ہی اُٹھ کر میں سنگم کی طرف چل دیتا ہوں اور لوک پتی کے پاس پہنچ کر ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔۔۔ ”ہے، لوک پتی!۔۔۔ بھگوان کے لیے میری حجامت بناؤ۔ تم نے کب سے مجھے اس حالت میں لٹکا رکھا ہے، نہ جیتا ہوں نہ مرتا

ہوں۔۔۔حالانکہ میں نے تمھیں پُورا ٹیکس دیا ہے۔"

لوک پتی، جس نے کسی کے چہرے پر کچھ خط لگا رکھے تھے، اسے چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے۔"آپ ذرا ٹھہریے، شریمان" —

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ آدمی احتجاج کرتا ہے "مجھے دُکان پر جانا ہے۔"

"سبھوں کا جانا ہے بھیّا" لوک پتی کہتا ہے۔ "سبھوں کو جانا ہے۔۔۔ کل ان کی حجامت بیچ ہی میں رہ گئی تھی۔"

"یہ جائیں بھاڑ میں، اور تم جاؤ جہنّم میں" وہ آدمی مُنہ پر کف لاتے ہوئے کہتا ہے۔ ان کی تو کل حجامت رہ گئی، میں پچھلے اتوار سے اَن مُنڈا بیٹھا ہوں" —

معلوم ہوتا ہے اس آدمی کی برداشت آخری حد تک پہنچ گئی ہے اور وہ لوک پتی کو مارے گا، لیکن لوک پتی کی ایک ہی کڑی نظر اور ہاتھ میں اُسترا دیکھ کر وہ کہتا ہے۔۔۔"اچھّا۔۔۔ مت بھُولیو، ان کے بعد میری باری ہے۔"

اور میں اطمینان سے لوک پتی کے ہاتھ میں اپنا گلا دے رہتا ہوں اور سوچتا ہوں، کچھ بھی ہو، لوک پتی آدمی بُرا نہیں۔ معاملے کا بہت کھرا ہے۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں چہرے کا وہ حصّہ صاف ہو جاتا ہے، جو کل اَن کٹا رہ گیا تھا۔ میں اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ کیا جرنیلی سڑک، بلکہ آٹوباہن کی طرح سے صاف ہے، جس پر کوئی سو میل کی رفتار سے گاڑی چلا سکتا ہے۔ جبھی لوک پتی مجھ سے کہتا ہے۔ ''اب آپ اُٹھ جایئے۔''

''کیا مطلب؟'' میں آخری بار حیران ہو کر پوچھتا ہوں۔

''جو اَن کٹا رہ گیا تھا، وہ میں نے کاٹ دیا۔''

''مگر'' میں چہرے کے دوسرے حصّے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہوں۔ ''رات میں ادھر بھی تو بال اُگ آئے ہیں۔۔۔؟''!!۔۔۔!۔۔

''کٹ جائیں کے ببوا۔۔۔ وہ بھی کٹ جائیں گے۔'' لوک پتی سِلّی پہ اُسترا تیز کرتے ہوئے کہتا ہے۔۔۔ ''باری سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اور میں ڈائیک پر کھڑا اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا ہوں جو آئے گی، پر نہیں آئے گی۔ کوشِک بلند آواز سے اپنی فتح مندی پر ہنس رہا ہے۔ چندر بھان نہ معلوم کس کو دیکھ کر ایکٹرس جمنا کا وہ شعر پڑھنے لگتا ہے، جو اس نے فلم ''دیوداس'' میں بولا تھا

کوئی میرے دل سے پُوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

سامنے دریا میں عورتیں نہا رہی ہیں۔ ایک دوشیزہ نے ہر قسم کی شرم و حیا سے بے نیاز ہو کر سب کپڑے اُتار دیے اور زور سے انہیں دُور، کناروں کی طرف پھینک دیا اور پورے پر تول کر پانی میں کود گئی، جتنے زور سے پانی اس سے لپٹنے کو آیا۔ اس حسین ڈرائیونگ کے بعد ابھی وہ سطح پر نہیں آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، نیچے سرسوتی کی تھاہ پانے کی کوشش کر رہی ہے۔

جاتری لوگ نہ معلوم کیوں ایکا ایکی چوکس ہو گئے اور اب پانڈوں کے پھُول نہیں

بکتے۔ وہ ٹوکریاں ہاتھ میں لیے سب کی طرف بڑ بڑ دیکھ رہے ہیں۔

قلعہ جسے شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا، ایک منی ایچر ہو گیا، جو وقت کے عجائب گھر میں پڑا ہے۔ مندر زمین میں دھنس چکے ہیں اور بندر شاید اوپر چاند، شکر اور منگل پر کُود گئے، جو اب ہماری دھرتی کے صوبے ہو چکے ہیں۔۔۔ ایک فقیر جو شکل سے حکیم وقت معلوم ہوتا ہے، بد دُعا دیتا ہے، جو مجھے دُعا معلوم ہوتی ہے۔۔۔

”جا بچّہ! سیفٹی کے سِوا تیرا کوئی دارُو نہیں۔“

اور میں خوشی خوشی گھر لوٹ جاتا ہوں، جس کا راستہ بازار میں سے ہو کر جاتا ہے!

دیوالہ

روپ متی، میری نند، جوان ہو چکی تھی۔ اس کی جوانی کا ثبوت شریر ہی نہ تھا اس کا، لچھن بھی تھے۔ وہ اس کا چونک کے بات کرنا، بے وجہ ہنسنا، بے سبب کی دلگیری، بدگمانی اور پھر، سب سے بڑی بات۔۔۔ خواہ مخواہ کی راز داری!

مجھے یہ دنیا کبھی اچنبھے کی بات نہ معلوم ہوئی اور نہ ہی اس میں کوئی بہت بڑا بھید دکھائی دیا۔ ہاں۔۔۔! بارہ ساڑھے بارہ کی تو تھی، جب باپو نے کانونٹ سے مجھے اُٹھالیا اور شادی کر دی۔ اُدھر شادی ہوئی، اِدھر میں مندروں کی اس بستی دیول

نگری میں چلی آئی۔۔۔یہ نیچے چونے گچ میں جو گول گول شیشے ٹنکے ہیں اور ساج کی لکڑی کا بڑا پھاٹک ہے، سب جبھی بنا تھا۔ ہاں، لوہے کے یہ موٹے موٹے کیل بعد میں گاڑے تھے اور دروازے پر گنیش جی کی مورتی؟ یہ بھی بعد ہی میں بنی تھی۔

میں یہیں، ہوا محل کے اس بخارچے میں بیٹھی تھی۔ ہونٹوں کا لاکھا لکھوٹا مجھے خود بُرا الگ رہا تھا۔ مگر سسر، جیٹھ وغیرہ سبھی پیڑھی پہ گئے ہوئے تھے۔ دڈّا بھی مندر سے نہیں لوٹی تھیں۔ یہ بھی شہر میں نہ تھے۔ اتنا ہی پتہ تھا دیس بھر کی، ارنڈی قابو میں کرنے گئے ہیں۔ ایک بار قابو آ گئی تو اپنا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر جائے گا، اگرچہ بہت سوں کے دیوالے نکل جائیں گے۔۔۔

کھاتا پیتا گھر، یہاں سبھی فیشن کے طور پر کام کرتے تھے۔ کھائی پکائی کے علاوہ اور کیا تھا؟ صبح ہوتی تو ہم سوچتیں۔۔ کیا پکے گا؟ دوپہر تھوڑے کپڑے اِدھر اُدھر پھینکنے کے بعد۔۔۔شام کیا پکے گا؟ کوئی پوچھے۔ گھوم پھر کے ارہر اور اُڑد ہی پہ پہنچتا ہے، تو واویلا کیسا؟ وہی روز کی باتیں، روز کے چہرے! ساس میری دیکھنے میں

بُری نہیں، لیکن کبھی بھنگن ہی اس سے اچھی لگنے لگتی۔ اس لیے جب گھر بھر سے جی اُوب جاتا تو میں یہاں آ بیٹھتی۔ تم نے دیکھا ہے نابالوں کی ماں؟ یہ بخار چہ نیچے سے یوں ہی سا لگتا ہے، مگر ہے رامائن کا پُشپ بُوان۔ ایک اَٹھ کلیا کمل لال سیمنٹ کا جسے تھامے کھڑا ہے۔ گھر کی طرف پیٹھ کر کے دیکھو تو نیچے بازار میں سب آر جار دکھائی پڑتی ہے۔ بھنگی، چمار، کھاد کے نئے کارخانے میں کام کرنے والے مجور۔ یوں گریب پر بدن میں محنت کا سُرور، چہرے پر صحت کا نور، سینہ تانے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے چٹان سے چٹان پھوڑنے جا رہے ہوں۔ اس بات کی بھی پروا نہیں، مجوری ملے گی یا نہیں ملے گی۔ پھر اِکّے والے جن کی چھاتی کے تسلوں میں گالیاں ہی اُبلتی رہتی ہیں۔ دوسروں کو تو کم ہی دیتے ہیں، اپنے جانور کو زیادہ۔ اپنے آپ کو سب سے زیادہ۔ اور اس پہ بڑے خوش، مارا ماری کرتے جا رہے ہیں۔۔۔ تیز تیز، جیسے سویرا پورب سے کرنیں پھینکتے اُمڈتا ہے۔ اِدھر چھانٹا، اُدھر چابک۔ لوگ یوں اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں جیسے رات کا اپرادھ دن ہوتے ہی کوٹھڑیوں، میلے کچیلے کپڑوں اور نالیوں میں جا چھپتا ہے۔ مُنیم،

دلال، سٹئی دھوتی کا پلّو سمیٹتے ہوئے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ مگر جو بیچ سڑک کے جا رہی ہیں، تو اپنی للا ئنیں۔۔۔ ہر وقت بیٹھے رہنے سے جن کے پیٹ میں ہوا، پیچھے ماس کے لودے چلے آئے ہیں، جیسے کسی نے بڑے بڑے تکیے باندھ دیے ہوں۔ چلتی ہیں تو پیچھے سے بُدّھ ویر، بُدّھ ویر کا جاپ ہوتا ہے۔ پرات کھیر کی ہاتھ میں، پانڈے جی ساتھ میں۔ دنیا جہان سے بے خبر۔ برائے نام گھونگھٹ کاڑھے، پتہ نہیں کس مندر کو جا رہی ہیں؟ بڑے سے بڑا لوہے کا ڈنڈا بھی ان راستے کے پتھّروں کو نہیں ہٹا سکتا۔۔۔ پھر اپنی جات برادری کے سیٹھ، جات باہر کے بیوپاری، جن کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا ہے۔ بیچ رانوں کے تھیلیاں، جن کی طنابیں تک کمر میں بندھی دِکھ رہی ہیں۔ تِس پہ بھی چھوکریوں کو گھور رہے ہیں۔ گھورتے مُشٹنڈے بھی ہیں لیکن ایک نگاہ میں پِل پڑنے والا پیار اور آشا، دوسرے کو نظروں میں گھِن اور نِراشا۔ چھوکریاں بھی تو ان سے نہیں شرماتیں۔ شرمائیں کن سے؟

ایسی باتیں دیکھ کے جی اور بھی گھبرا جاتا ہے۔ پھر میں سامنے دیکھ لیتی ہوں۔ پورا

مارواڑ نظر آتا ہے۔ پتھّر ہی پتھّر بالُو ہی بالُو۔ سورج کی روشنی آڑی پڑتی ہے تو بالُو کی کنی کنی دمک اُٹھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے، اَن گِنت مُہریں پڑی ہیں۔ اُٹھالو اور اندر باہر سب بھرلو۔ دیس بھر کا سونا رُوپا اسی دھرتی میں چلا آرہا ہے۔ بس یہی جھوٹی چمک دمک ہے، ہریالی کہیں بھی نہیں۔ کہیں کوئی جھاڑی یا کُسل دُوب دکھائی دے جاتی ہے، لیکن درخت نام کو نہیں۔ دُور وِندھیا کے آنگن میں کوئی ٹِنسا کا پیڑ کھڑا ہے یا جھیل کے کنارے بجاسل سر ہلا رہا ہے۔ وہ بھی نیچے سے ٹُنڈ مُنڈ۔ اُوپر ایک گُپھا سا ہے، وہی دل کی دھڑکن تیز کر رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں، کوئی ہمارا سب سونا لے لے اور ہریالی دے دے۔۔۔

مان متی، میری ساس، مجھے ہمیشہ یہاں بیٹھنے سے منع کرتی ہے۔ لیکن جب بھی میں یہیں بیٹھتی ہوں، ضد کے ساتھ، ٹھینگے کی طرح۔ اس کا کہنا ہے، کھڑکی میں بیٹھنا کام نہیں بہو بیٹی کا۔ کھڑکی میں بیٹھتی ہے تو گنگا۔ میں کہتی ہوں یہی حساب ہے تو پھر ہماری طرح کی سبھی گھریلو عورتیں گنگا ویشیا ہیں۔ ہمیں کھڑکی جھروکا بھی نہ ملے تو اس سے مر جائیں۔ ہے نا بابو کی ماں؟ کھڑکی کے لیے عورت ہو نہ ہو،

عورت کے لیے کھڑکی بڑی ضروری ہے۔

لیکن اُس دن ہمیں کون ٹوک سکتا تھا؟ گوکل اشٹمی کا دن تھا۔ گوپیوں کے کاہن آج کے دن پیدا ہوئے تھے۔ رادھا بازار میں کوئی ہما ہَمی تھی؟۔۔۔رام رام! ساری لوکائی اُمنگ کی طرح باہر چلی آئی تھی اور ترنگ کی طرح ناچتی، گاتی، بل کھاتی جارہی تھی۔۔۔ سانول داس کے مندر کی طرف۔ اس میں عورتیں بھی بہت تھیں۔ جیسے ان کے بِنا سب ادھورا ہے۔ دھکّے پڑتے تو بُرا بُرا منھ بناتیں۔ اُوپر سے گالیاں دیتیں، بھیتر سے خوش۔ ایسا نہ ہوتا تو باہر ہی کیوں نکلتیں؟ یہ عجیب بات ہے۔ ہم عورتیں جس بات کو پسند نہیں کرتیں، آخر میں وہی کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے میں غلط کہہ رہی ہوں۔ مگر۔۔۔ ہمارے من کا پسارا انوکھا ضرور ہے۔ مردوں کو اس بات کا کیا پتہ؟ وہ تو سارا پڑھ لکھ کے بھی جانگلو ہی رہتے ہیں۔ بَس سیدھے۔۔۔ فلاں کام کرو، نہیں مار دیں گے یا۔۔۔ خبردار! جو ساوتری کے ساتھ منڈوے کو گئیں۔ وہ اچھی عورت نہیں، ہوٹلوں میں جاتی ہے۔ کوئی پُوچھے، تمھیں کیسے پتہ ہے جی؟ بے چارے! ہمیں جانے کیا سمجھتے ہیں؟ نہیں

جانتے جتنی دیر میں ان کے دل میں ایک خیال آتا ہے، ہمارے من سے بیسیوں ہو کے نکل جاتے ہیں۔ ہاں، تو اُس دن سب عورتیں کھڑکیوں میں چلی آئیں۔ جڑت مڑت، انگ، بانکڑی اور گہنوں کی نمائش تھی۔ سب عجیب سی نظروں سے نیچے بازار میں دیکھ رہی تھیں۔ پلّو سر سے ہٹے ہوئے، چوٹیاں نیچے لٹکی ہوئیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سیڑھیاں ہیں جو گھر کے بھیدی نے لٹکا رکھی ہیں، تاکہ باہر کا چور ان کے سہارے چلا آئے اور آنکھوں کی کھڑکی سے اندر کود پڑے۔ پھر کیا ہے؟

۔۔۔سامنے تجوری پڑی ہے، تالی گھر والوں کے پاس۔ ہمّت ہے تو توڑ لے۔۔۔

کہاں تو میں اکیلی ہی بیٹھی تھی، کہاں رُوپ متی، ساس، ددّا سبھی آ گئیں۔ جبھی پتہ چلا، ددّا تو کب سے آئی بیٹھی تھی۔ کہیں اندر کے مندر میں گھنٹی بجا رہی تھی۔ ددّا اور ساس دونوں باہر دیکھ رہی تھیں، چہرے پر کوئی اثر نہیں۔ منھ بیرنگ لفافوں کی طرح۔ پیسے دو اور چھڑا لو۔ نہیں بھیجنے والے کو واپس۔ ہاں رُوپو کا منھ کھلا تھا۔۔۔ میں نے کہا—

روپو! تو ادھر آجا اچھّی۔۔۔ میرے پاس۔

بولی۔۔۔ نہیں بھائی، میں ٹھیک ہوں۔

پیچھے سے دِدّا بولی۔۔۔ ارے! پیار سے بُلاتی ہے بھابی۔ جاتی کیوں نہیں؟

روپو نے شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ گویا مجھے اس کی کوئی بات پتہ چل جائے گی۔ میں نے یوں دیکھا جیسے نہیں چلے گی اور وہ اُٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے جو اپنی بانہہ اس کے گرد ڈالی تو پتہ چلا، اس کے کولہے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ ایک سال پہلے یہی روپو کچھ بھی نہ تھی۔ اب سبھی کچھ ہے۔ ابھی میں نے اُس سے پیار کی ایک بات بھی نہ کی تھی کہ ساس کی آواز آئی۔۔۔

بہُو! سر ڈھک اپنا۔ کیسے بیٹھی ہے؟

میں نے اُسی دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور سر ڈھکنے لگی۔ میں تمھیں سچ کہتی ہوں بالو کی ماں۔ مجھے نہ پتہ تھا، میرے سر پہ کپڑا نہیں۔۔۔ ننگی ہی بیٹھی ہوں۔ اُن عورتوں کی طرح جو سامنے بخارچے میں کھڑی تھیں اور تن من سبھی کو ہوا لگوا رہی

تھیں۔ میں پھر دونوں ہاتھ رکھ، یہاں کھڑکی میں ٹکا، ان پہ ٹھوڑی رکھ، نیچے دیکھنے لگی۔۔۔

نیچے اب عورتیں تو کہیں کہیں تھیں۔ مرد ہی مرد تھے۔ چھوں اور کوئی لمبا، کوئی ناٹا، کوئی چھوٹا، کوئی موٹا۔ کسی نے داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کوئی صفاچٹ۔ کسی نے سر کے بالوں کے پلیٹ بنا کندھے پہ پھینک رکھے ہیں، کوئی پان کھا رہا ہے اور تھوک رہا ہے۔ کوئی بیڑی کی راکھ چٹکی سے گراتا ہے۔ کوئی لڑتا ہے، کوئی گالی دیتا ہے، کوئی گالی کھاتا ہے۔ لیکن اوپر کو سب دیکھ لیتے ہیں، بجلی کے تاروں کی طرف۔۔۔ اس سال کچھ زیادہ ہی مرد تھے۔ ایک دم یہ اتنے کہاں سے چلے آئے۔۔۔ بیچ میں ایک ٹھٹ سا بندھا تھا اور باقی کے سب اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ اُن کے سروں پہ کوئی سات گز کی اونچائی پر ایک رسّی لٹک رہی تھی، جس کا ایک سرا رنگڑوں کے گھر اور دوسرا چھنڈواڑے کے سیٹھ کے ہاں سے بندھا تھا اور اس رسّی کے سہارے بازار کے عین بیچ مٹکی لٹک رہی تھی۔ یہ وہی مٹکی تھی جس میں ماتا جسودھا مکھن رکھ دیا کرتی تھی اور اوپر ٹانگ دیتی

تھی۔ وہ سمجھتی تھی، نٹ کھٹ اس تک نہیں پہنچ پائے گا مگر وہ اپنے ساتھیوں کے کندھوں پہ چڑھ کر پہنچ ہی جاتے تھے۔

تو اس گھیرے میں سے نکل کر کچھ آدمیوں نے دوسروں کے کندھوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پھر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال، اندر کی طرف منھ کر کے کھڑے ہو گئے۔ پھر دوسرا اپرا آیا تین آدمیوں کا اور پہلے چھ کے کندھوں پہ چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر بھیڑ میں سے سانولے رنگ کا ایک جوان لڑکا نکلا اور پھُرتی سے باقی سب پہ یوں چڑھ گیا جیسے وہ مرد نہیں، سیڑھیاں ہیں۔ شکھر پہ پہنچ کے وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی قمیص میلی تھی اور اس پہ رنگ لگا ہوا تھا، بٹن کھلے تھے۔۔۔ میں تو تم سے سب بات کر سکتی ہوں، بالو کی ماں، جیسے تم مجھ سے کر لیتی ہو۔۔۔ میرا دل دھڑک اُٹھا۔ اس لیے بھی کہ اس کے پَیر ابھی نہیں جمے تھے۔ وہ گِر بھی سکتا تھا۔ ایک دم اس کے پیر تھرّائے اور وہ جھک گیا اور پھر اسی دم تن کے کھڑا ہو گیا۔ اب اُس کے پیر جَم چکے تھے۔۔۔

لوگوں میں ایک شور مچ گیا۔ وہاں کھڑے ہوتے ہی اس لڑکے نے سیدھا اس

طرف دیکھا، جہاں میں بیٹھی تھی۔ ایک بجلی سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ پھر اس لڑکے نے دونوں ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں گاڑ دیے اور سر کے اوپر اُٹھا کر ہاتھ ہلائے، کانپا، سنبھلا۔۔۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے لہُو میرے منھ کو آرہا ہے۔ میری کنپٹیاں تک کانپنے لگیں۔ آخر اس نے ایک ہاتھ اوپر کرکے مٹکی تھام لی۔ لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ مٹکی تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام رکھا تھا۔ اس نے پھر اس طرف دیکھا جہاں میں بیٹھی تھی۔ روپو بیٹھی تھی، ساس اور ددّا بیٹھی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری ہی طرف دیکھ کر مُسکرا رہا ہے، جیسے وہ مجھے جانتا ہے۔ میں نے اُسے کبھی دیکھا ہے، لیکن جانے کتنی پُرانی بات ہے جس میں سمے نے تصویر دھو ڈالی ہے، لکیریں سی رہ گئی ہیں۔۔۔

میں نے چور نظروں سے رُوپو کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک منھ کھولے بیٹھی تھی۔ جیسے بچے تماشے میں کھول کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا بدن جل رہا ہے۔ اس میں سینک نکل رہی تھی اور آس پاس بیٹھی عورتوں کو لگ

رہی تھی۔ مجھے یقین ہے مجھ سے بُو اُٹھ رہی ہو گی مگر کسی نے کچھ کہا نہیں۔۔۔

اب تک میری جیٹھانی بھی آ بیٹھی تھی۔ ایک میں ہی تھی جس کے ہاں لاکھ کرنے پر بھی کوئی بچّہ نہ ہوا اور ایک وہ تھی، ہر سال جس کے پیٹ میں سے ایک کیڑا باہر چلا آتا تھا۔ اور میری جیٹھانی کو وہم کی بیماری ہو گئی تھی۔ ایک میں تھی جسے کوئی چیز گندی نہ دکھائی دیتی تھی اور ایک وہ، جسے ہر چیز غلاظت سے پٹی مری معلوم دیتی۔ ہر وقت ہاتھ، منھ، کپڑے دھوتی رہتی۔ خاص طور پر نل۔ اب بھی وہ نل کو راکھ سے مانجھ کر ہاتھ دھوتی ہوئی چلی آئی تھی۔ ہاتھ تولیے سے نہ پونچھے تھے کیونکہ گھر میں ہر آتا جاتا، اسی تولیے کو استعمال کرتا تھا۔ آ کر اس نے گیلے ہاتھ بھی جھٹکے تو پانی کے چھینٹے مجھ پہ پڑے۔ یوں لگا جیسے اوڑ لگی دھرتی پہ برسات کی پہلی بوندیں پڑی ہوں اور بھک سے اُڑ گئی ہوں۔

میں مُڑ کر دیکھا، روپو جا چکی تھی۔ شاید میرے پاس بیٹھ کر اُسے سینک لگ رہی تھی۔ یا پھر وُہی اس کی بھید بھری باتیں۔ کبھی پتہ نہ چلا اگلے دم کیا کرے گی؟ اتفاق سے نظر نیچے گئی، تو وہ اُسی ساج کے پھاٹک سے باہر کھڑی تھی اور اشٹمی کے

جلوس کو دیکھ رہی تھی، جبھی وہ لڑکا لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر مٹکی کے پانی کو باہر گرا رہا تھا۔ پھر وہ ہاتھ مار مار کر اسے توڑنے لگا۔ مگر وہ مٹکی جانے کس مٹی سے بنی تھی کہ ٹوٹتی ہی نہ تھی۔ آخر وہ اُسے ٹکّے مارنے لگا۔ جب اس پہ بھی نہ ٹوٹی تو اس نے مٹکی میں اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ جانے کیا ہوا؟ میری آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں۔ پھر تھوڑا کھلیں تو وہ ابھی تک سر مار رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پھر آنکھیں نُوٹ لیتی، مٹکی پھوٹ چکی تھی اور لوگ شور مچا رہے تھے۔۔۔

لڑکے نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے سر کو لگی ضرور تھی مگر چہرے سے اس نے کوئی بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اس نے جیب سے میلا کچیلا ایک رومال نکالا اور گردن پونچھ لی۔ پھر وہ اپنے آپ جھک گیا اور ہولے ہولے نیچے اُترنے لگا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ نیچے کے پرے پہ پہنچ کے وہ لڑکھڑا گیا۔ وہ گرا۔۔۔ میں لپکی، مگر بے شمار لوگوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے بچا لیا۔ ددّا نے میری طرف دیکھا اور ہنس دی۔ ساس نے تیور چڑھا لیے۔ میں وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ نیچے دیکھا تو وہ لڑکا کہیں بھیڑ میں گُم ہو چکا تھا۔ میں یونہی مورکھوں کی طرح اس

طرف دیکھتی رہتی۔ جی چاہا نیچے لپک جاؤں اور اُسے ڈھونڈ ڈھانڈ کے پوچھوں۔ کہیں بہت تو نہیں لگی؟ مگر۔۔۔ میں یہاں سے ایک دم کیسے جا سکتی تھی باہر؟ صدیوں کی بنی رسم کو پل بھر میں کیسے توڑ دیتی۔۔۔ مَن کو مار کے یہیں بیٹھی اور سوچتی رہی۔

رات آ گئی۔ اشٹمی کی رات۔ میری طبیعت جب تک بہت بوجھل ہو چکی تھی۔ تنکا توڑ دھرا نہ کیا تھا لیکن اتنی تھک گئی تھی کہ بس۔۔۔ آج گھر میں ایک ہی چیز کام کی ہوئی اور وہ یہ کہ ارہر کی دال نہ پکی تھی اور نہ اُڑد، نہ کڑھی۔ میری جیٹھانی نے کٹھل کی وہ پیاری سبزی بنائی تھی کہ زبان سے الگ نہ ہوتی تھی۔ بالکل ماس کا مزہ تھا۔ ہاں، بالو کی ماں! تم سے کیا چھپانا؟ میں نے ماس کھایا ہے۔ چوری چوری کئی بار کھایا ہے۔۔۔

روپو آ گئی۔ ویسے ہی بے وجہ ہنستی ہوئی۔ یہاں بستر سے اُٹھنا دوبھر ہو رہا تھا، لیکن وہ تھی کہ اپنے سبک پاؤں پہ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھسلتی جا رہی تھی۔ اتنی چہک اس میں کہاں سے چلی آئی؟ میری طرف دیکھ کر وہ شرارت سے

مُسکرائی اور بولی۔۔۔

"بھیّا کب آنے والے ہیں چھوٹی بھابی؟"

میں نے کہا۔ "کیوں؟"

روپا سمجھتی تھی کہ اس کے بھائی کے نام پہ میں شرما جاؤں گی، جیسے دوسری عورتیں اپنے مرد کے نام پہ شرما جاتی ہیں۔ مگر، ہماری شادی اب کوئی نئی بات نہ تھی اور شرمانے کی اتنی بات ہی کہاں رہی تھی۔

روپا بولی۔۔۔ "پتہ بھی ہے آج ہنڈولے ہیں؟ وہ جھونٹا دیتی کہ آسمان سے جا لگتیں۔"

"اُونہہ۔۔۔!" میں نے بیزاری سے کہا اور چُپ ہو گئی۔

روپا جنم اشٹمی کے دن مجھے اور اپنے بھیّا کو ہنڈولے میں بٹھا کر بڑی خوش ہوتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا سواد آتا تھا۔ شاید یہ سمجھتی ہو گی رادھے شام کی جوڑی

ہے۔ جب کہیں لمبا اور تیز جھونٹا دیتی، تو میں ڈر کر ان سے چمٹ جاتی اور روپا دیکھ کر بہت ہنستی۔ بیچ میں میں ایک دو بار گر گئی اور یہ مجھے تھام بھی نہ سکے۔ میری جیٹھانی کے بچوں نے بیر کھا کھا کر گٹھلیاں جگہ جگہ پھینک رکھی تھیں۔ ایک میرے سر میں گھُس گئی۔ جب سے میں نے جھولے ہنڈولے پہ بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ بیٹھتی بھی ان کا سہارا لینے کی بجائے رسّہ تھام لیتی جس سے روپا کا سب تماشہ ختم ہو گیا۔

روپا بیٹھی رہی اور ہر قسم کی شرارتیں کرتی رہی۔ کبھی وہ میرا کے بھجن گانے لگتی۔ کبھی باجے میں فلم کا ریکارڈ لگا دیتی اور تالی بجا بجا کر ساتھ ناچنے لگتی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔۔۔ جب تک اُن کے پِتا اور بڑے بھائی آ گئے تھے۔ میں جانتی تھی ددّا، ساس اور جیٹھانی ہنڈولے دیکھنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں سوچ رہی تھی، اب سانول داس کے دیول جانے کے لیے کہا تو میں کیا بہانہ کروں گی؟ جبھی مجھے اس لڑکے کا خیال آ گیا جس نے مٹکی پھوڑی تھی۔ میں نے بڑے پیار سے رُوپا کو بُلاتے ہوئے کہا۔۔۔

"روپو۔۔۔تو نے دیکھا تھا آج کا جلوس؟"

روپو نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔۔۔"ہاں، بھابی"!

میں نے پوچھا۔۔۔"اور وہ ترپالی دیکھی تھی؟"

روپا بولی۔"ہاں۔"

"اور وہ لڑکا؟"

روپو نے پہلے انکار میں سر ہلا دیا اور پھر۔۔۔اقرار میں۔ وہ اتنی جلدی میں تھی کہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر پائی۔ اس نے ایک تیز سی نظر مجھ پر پھینکی اور چُپ کھڑی ہو گئی۔

میں کچھ نہ سمجھی۔ اُلٹا میں ہی پوچھنے لگی۔۔۔"کون لڑکا بھلا؟"

روپو نے منھ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔۔۔"مجھے کیا معلوم؟"

"ارے وہی!" میں بولی۔ "مٹکی پھوڑ۔۔۔"

اور صرف روپا کو چھیڑنے کے لیے میں نے کہہ دیا۔ ”کیسے تمہاری طرف دیکھ دیکھ کے ہاتھ ہلاتا تھا۔ اشارے کرتا تھا، جیسے اچھی طرح جانتا ہو۔“ میں چاہتی تھی روپا مجھے چھیڑے۔ مجھے کہے۔ وہ تمہیں بلا رہا تھا، بھابی۔۔۔ مگر روپا چپ رہی۔

نہ صرف چُپ۔۔۔ اُس کی سانس تیزی ہو گئی۔ اس نے پھر مجھے دیکھا، جیسے میرے اندر کی کوئی چیز ٹٹول رہی ہو۔ ایک پل کے لیے تو میں بھی گھرا گئی۔ پر میں نے سوچا، میں نے کیا کیا ہے جو خواہ مخواہ کی چور بنوں؟ میں نے دلیری سے رُوپا کو اور بنانا شروع کیا۔ جب وہ بہت گھبرائی تو میں سمجھی، اس کی تو عادت ہے؟۔۔۔ مجھے کیا پتہ، آج کیا ہونے والا ہے؟ میں نے مسکراتے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کیسے سر مار مار کے مٹکی پھوڑی تھی اُس نے؟“

روپا اسی طرح اُٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی۔ میں نے دیکھا پہلو سے اس کی دھوتی پھٹی ہوئی تھی اور اس سے پرے کچھ خُون کے دھبّے تھے۔۔۔ روپا ایک سال سے رجسوّلا تھی۔ میں نے کہا وہ پھر شروع ہو گیا ہے اور یہ پھوہڑ نہیں جانتی۔

"دھوتی تو بدل، کُتیّا۔۔۔میں" نے لفظوں کو تھوڑا چباتے ہوئے کہا۔۔۔ پھٹی پڑی ہے، سب لہُو لگا ہے۔

رُوپا کچھ مڑی اور دھوتی میں پھٹی ہوئی جگہ اور خون کے نشانوں کو چھپاتے ہوئے ہڑبڑا کر باہر نکل گئی۔

میں نے اس واقع کو کوئی خاص وہ نہ سمجھا۔ ایسا تو قریب قریب ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے، جب وہ عورت بنتی ہے۔ ہولے ہولے وہ اپنا آپ سنبھالنا سیکھ لیتی ہے۔ کئی جب بھی پھوہڑی رہتی ہیں۔۔۔ میں نے سوچا، یہ بھی پھوہڑی رہے گی۔۔۔ رُوپا!

رات جو کچھ ہوا، اس سے مجھے پتہ چلا یہ سب جادو کُتیّا کے شبد نے جگایا ہے۔ مجھے کیا پتہ بالو کی ماں؟ تو تو جانتی ہے ہم یونہی پیار سے بھی ایک دوسری کو کُتیّا کہا کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا؟ ہم ہنڈولوں پہ گئے۔ روپے پیسے، سونے چاندی کی ہمارے دیس میں کیا کمی؟ کنجوس لوگ، پیسے پیسے کے لیے مرنے والے۔۔۔

شادی بیاہ، تیج تیوہار پر سب کونوں کھدروں میں پڑی دولت اُٹھالاتے ہیں اور بیچ چوراہے پہ رکھ دیتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ دیکھو۔۔۔ دیکھو اور جلو۔ میں کیرت دات ہوں، جس کی دھن باد میں تین کوئلے کی کانیں ہیں۔ کلکتے میں ربڑ اور پلاسٹک کا سب سے بڑا کارخانہ۔ بمبئ میں کاٹن گرین کے گودام اپنی روئی سے بھرے پڑے ہیں۔۔۔ تو سانول داس کے دیول میں لاکھوں کا چڑھاوا چڑھ گیا۔ میرے سسر نے مورتیوں پر سونے کا پتر اجڑوادیا اور شیام سندر کی آنکھوں میں بڑے بڑے نیلم لگوادیے۔

میں اگرچہ تھکی ہاری تھی مگر ساتھ چلی گئی تھی۔ یوں ہی۔۔۔ ایک امید کے ساتھ اور کچھ نہیں تو رونق دیکھ لوں گی۔ گھر میں کیا رکھا ہے؟ پڑی رہی تو اپنے آپ کو کھا جاؤں گی۔ وہاں بھیڑ میں دو چار دھکوں کے سوا اور کچھ نہ ملا۔۔۔ اور اس کے بعد ہم گھر چلے آئے۔ رُوپا نہیں آئی تھی۔ سب منت سماجت کرتے رہے مگر روپا نے ایک ہی نہ پکڑ لی۔ سب جانتے تھے یہ ایسا ہی کرتی ہے، اس لیے ساری پرواکے ہوتے ہوئے بھی کسی نے پروانہ کی۔

لوٹتے سمے اور گھر پہنچ کے میں نے بار بار سوچا۔ یہ ہی آجائیں۔ مگر، انہیں کیا پڑی تھی؟ اُنہیں تو دیس بھر کی ارنڈی چاہیے تھی۔ دنیا بھر کی دولت، پیسے، پیسے اور پیسے کے سوا انہوں نے کچھ سوچا، نہ ان کے باپ دادا نے۔ ہماری کتنی خواہش ہوتی ہے، بالو کی ماں! ہم اپنے پتی کے ساتھ باہر جائیں۔ میں تو کہتی ہوں اس بات میں پتی پریم بھی اتنا نہیں ہوتا، جتنا یہ خیال ہوتا ہے کہ باہر جائیں۔ اپنا آپ دکھائیں اور جب کوئی بہت دیکھے، تو اپنے ہی مرد کے کندھے پہ ہاتھ رکھ لیں اور کہیں ۔۔۔ بھگوان نے سب دیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو! تم بیٹھو، ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لو۔ آہیں بھرو، جلو، مرو۔۔۔

ہاں، ہم اتنا ہار سنگار، زیور کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟ اسی لیے نا کہ کوئی دیکھے مگر ہاتھ نہ بڑھائے اور پھر اس سارے انکار میں اقرار چھُپا ہوا۔ من کے کسی کونے میں ایک چیز پڑی رہتی ہے جو ہر آتے جاتے من چلے کی ہمّت کو للکارتی ہے۔۔۔

گھر آتے ہی میں سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے دروازے بند کر کے میں نے اپنے سب کپڑے اتار دیے اور آئینے میں اپنا آپا دیکھنے لگی۔ کبھی ادھر

سے کبھی اُدھر سے۔ پھر بتّی بُجھا کر ایسے ہی بستر میں لیٹ گئی۔ باہر کسی نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔

''میں چونک اٹھی۔۔۔ کون؟'' میں نے پوچھا

آہستہ سے آواز آئی۔ میں۔ ''روپا''!

میں نے پاس پڑی چادر لپیٹ لی اور اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ رُوپو اندر آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ زار زار رو رہی تھی۔ آتے ہی وہ میرے قدموں پر ِگر پڑی۔ اور بولی۔۔۔ ''میری لاج رکھ لو، بھابی! میں مر جاؤں گی۔ کسی سے کہہ دیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔''

میری سمجھ میں جب تو کوئی بات نہ آئی۔ مگر۔۔۔ ہم عورتیں۔۔۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ ''نہیں، میں کسی سے نہ کہوں گی۔'' اور پھر۔۔۔ یونہی ۔۔۔ ''کیا ہوا؟'' روپا بولی۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو بھابی۔ وہ مجھے جانتا تھا۔''

''وہ کون؟'' میں نے پوچھا۔

"اب بنو مت۔" وہ بولی۔ "وہی مٹکی پھوڑ۔"

"تیرا ستیاناس!" میں نے دل میں کہا۔۔۔

روپا بولی۔ "جب بھی رادھا بازار سے گزرتی، ناکے پہ مجھے مل جاتا، اشارے کرتا، سیٹیاں بجاتا۔ لیکن میں پاس سے گزر جاتی، بُرے بُرے منھ بناتی، گالیاں دیتی۔ لیکن آج، پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ میں بھیڑ میں چلی گئی۔ صرف اس کے انگلی اُٹھانے پہ۔۔۔ اور پھر ہم دونوں بھیڑ سے نکل گئے اور شِو مندر میں چلے گئے، جہاں مسافروں کے لیے کوٹھڑیاں بنی ہیں۔ میں کانپتی جارہی تھی۔ آخر میں نے سوچا بھی کہ بھاگ کھڑی ہوؤں۔ مگر مجھے کچھ کرتے نہ بنی۔۔۔ اس کے بعد میں اندھی ہوگئی"!

میں سچ کہتی ہوں بالو کی ماں۔ میرا سارا بدن کانپنے لگا۔ پہلے مجھے غصّہ آیا، نفرت پیدا ہوئی، پھر سب کچھ جانے کیسے اپنے آپ ڈھل گیا۔ میں جی ہی جی میں اپنی مُورکھتائی پر ہنسی۔ مجھے جبھی کیوں نہ پتہ چلا، جب میں نے روپو سے یہ سب کہا

تھا؟ ابھی بارہ دن ہی تو ہوئے تھے جب روپو نہائی۔۔۔ اور آج۔۔۔ اچھا، اچھا۔۔۔ تُو فکر نہ کر۔ میں نے رُوپو سے کہا۔ تو نے کون سا ایسا کام کیا ہے جو کسی ماں کی بیٹی نے نہیں کیا۔ مگر اب تو اپنا آپا سنبھال۔ مہینہ بھر اپنا حال بتاتی رہنا، مُردی۔ کچھ ہو گیا تو کہیں کی نہ رہ جائے گی۔ صبح میں تجھے میتھرے اُبال کر دے دوں گی۔ اب تو سو رہ یہیں میرے پاس۔ کہاں جائے گی؟ اُسی کوٹھی میں؟ سب سوچیں گے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون چل رہا ہے۔ اس آدھی رات کے وقت۔۔۔

۔۔۔ اور سُن! میں تیری شادی کی بات چلاؤں گی۔ تو اُوں آں مت کیجیو۔ کرنا بھی ہے تو بس دکھاوے کے لیے۔ اتنا ہی جتنا ہم سبھی کرتی ہیں۔ مٹکی پھوڑ یونہی سا ہے کوئی راج مجور۔ اس کا تو سوچ بھی مت۔۔۔ ہاں۔۔۔ جو بات اچھی نہیں ہے، اچھی نہیں ہے اور جو اچھی ہے سو اچھی ہے۔ بھگوان نے تو مرد عورت کو بنا دیا۔ اور جب سے دنیا بنی ہے، وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور بھاگتے رہیں گے، جیسے چاند سورج بھاگتے ہیں۔ لیکن وہ بھی ایک راستے پر جاتے ہیں۔ یہ نہیں۔ اُس گلی، اُس بازار سے راستہ کاٹا اور پکڑ لیا ایک دوسرے کو۔ ایسا ہو تو یہ

دُنیا، یہ سنسار، یہ دھرتی، یہ آکاش، سب نشٹ ہو جائیں۔ سال کے دن کتنے ہوتے ہیں؟۔۔۔ تین سو پینسٹھ۔ ان تین سو پینسٹھ دنوں میں ایک بار چاند سورج کو اور ایک بار سورج چاند کو پکڑ لیتا ہے اور بس۔۔۔ اس لیے انسان نے اس چاند سورج کا بھی راستہ بنا دیا ہے اور وہ ہے شادی کا راستہ۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں۔ شادی ہوتی ہے، تب ماں باپ بھائی بہن خود لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ پھر تو کوئی راجہ مہاراجہ، جج، دیوان بھی کچھ نہیں کر سکتا۔۔۔

اور میں نے روپا کو چھاتی سے لگا لیا۔ اس کی بہت کچھ تسلّی ہو گئی تھی۔ میرے پاس پڑے پڑے وہیں سو گئی۔۔۔۔۔ نیند نہ آئی تو مجھے۔ یونہی جمائیاں لیتی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہلو بدلتی رہی۔ کبھی کبھی میرا ہاتھ روپا کے بدن پر پڑ جاتا۔ مگر وہ بے ہوش پڑی تھی۔ سب کچھ کر سُن کے ایک سُکھ کی نیند لے رہی تھی اور میں۔۔۔

مٹکی پھوڑ۔۔۔ روپا کے بھیّا۔۔۔ روپا، آئینے میں اپنا بدن۔ یہ سب کچھ آنکھوں

کے سامنے گھومتا رہا۔ پھر میں سوچنے لگی، یہ جو روپا سے کہتی رہی ہوں۔ سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ سچ اس لیے کہ کوئی قاعدہ قانون تو ہونا چاہیے۔ یوں ہی مرد عورت ایک دوسرے سے ملتے پھریں تو اولاد کو کون سنبھالے؟ کُنبہ کیسے بنے۔۔۔ اور جھوٹ اس لیے کہ شادی کے ایک دو سال تک سب ٹھیک رہتا ہے۔ پھر ہولے ہولے مرد عورت ایک دوسرے کو اتنا جان لیتے ہیں کہ پھر جاننے کی بات بھی نہیں رہتی، جیسے کوئی آدمی ہر سال آبو جایا کرے یا سوسر کی تحصیل کے ہزاروں چکّر کاٹ ڈالے۔ پھر مسوری کی گھاٹیوں ہی پہ چڑھنے کا مزا ہے۔ نہیں روح سو جاتی ہے اور ہولے ہولے جسم بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ جبھی تو ۔۔۔ کسی دوسرے کا ہاتھ لگے تو جسم اور روح دونوں چونک کر جاگ اُٹھتے ہیں۔ بیاہتا جیون میں یہ سب ہو سکتا ہے۔ اگر عورت مائیکے ہی جاتی رہے، چاہے وہ صبر کا مائیکا ہو یا مرد دورے پہ چڑھا رہے۔ کسی ایسی بڑی ریلوے کا گارڈ ہو جو مہینوں بعد گھر لوٹتی ہو۔۔۔ جب بھی۔۔۔ تبدیلی قانون ہے قدرت کا۔۔۔ ہمیشہ گرمی نہیں رہتی، نہ سردی رہتی ہے۔۔۔ شُکل پکش کی رات کا اپنا جادو ہے اور کرشن

پکش کی رات کا اپنا۔۔۔ سانپ کی کھال بھی اچھی ہے اور مور کے پنکھ بھی۔ پھر رنگ ہیں، خوشبوئیں ہیں، آوازیں ہیں۔۔۔ اَن جانی، اَن گنت۔۔۔

شادی بہت اچھی چیز ہے، بالو کی ماں۔ پر کیا سماں نہیں آیا اس میں تھوڑی سی تبدیلی آ جائے؟ یہ مرد عورت دونوں سے ایک ہی بات کہے۔ اس چھت کے تلے تم دونوں رہو گے۔ یہاں جو بچے پیدا ہوں گے، انسان ہی کے ہوں گے۔ مرد باہر کام پہ جایا کرے گا۔ عورت گھر سنبھالے گی اور بس۔۔۔ ہے بھگوان! میں کیا کچھ کہہ گئی۔ میرا مرا منھ دیکھو، بالُو کی ماں، جو ان باتوں میں سے ایک بھی کسی سے کہو۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے کئی بار خیال آتا ہے۔ میں بیوی ہونے کی بجائے ان کی پریتا ہوتی تو کتنی خوش رہتی۔۔۔!

ساری رات میں نے جاگ کے کاٹی۔ ساری رات میں سُولی پر ٹنگی رہی۔ جب صبح ہوئی تو یہ چلے آئے۔ میں لپک کر دروازے کی طرف گئی مگر انہیں مجھ سے بات تھوڑی کرنا تھی۔ میری طرف تو دیکھا بھی نہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا ہی کہہ دیتے کہ ہاں بھئی، تو بھی کوئی ہے۔ باہر جانے والے کا کیا ہے؟ ہزار شکل دیکھ

کے آتا ہے۔ ہم ہی گھر میں ایک دوسرے کا منھ تکا کرتی ہیں اور پڑے پڑے باسی روٹی کی طرح ہو جاتی ہیں۔ ہاتھ لگاؤ تو ٹھنڈی ٹھار، کھاؤ تو گرما گرم۔۔۔

ارنڈی کا سوداگر! ہُونہہ۔۔۔ پگڑی تو دیکھو۔ کیسے پیچ کے پیچ گلے میں پڑے ہیں جیسے مار کھا کے آیا ہے اور منھ پہ انجن کے کوئلے کا بُرادہ کھنڈ گیا ہے۔۔۔ کوئی جَم دُوت معلوم ہوتا ہے، نپنک کا بھُوت!۔۔۔ کمرے میں اور کسی کے جانے کی ہمّت نہ تھی۔ سوائے دِدّا کے۔۔۔ دِدّا گئی تو اسے بولے۔۔۔ "دِدّا جی۔ اسے کہو۔ کچّی لسّی کا گلاس بنا دے۔"

اس ساری نفرت کے باوجود میں اپنے آپ چل دی، لسّی بنانے۔ وہی صدیوں کی عادت، پل بھر میں تھوڑی چلی جاتی ہے؟ میں نے جی میں کہا۔ بڑا آیا ہے حکم چلانے۔ جیسے میں کوئی لونڈی باندی ہوں؟ ہاتھ جوڑے کھڑی ہوں؟ حکم کی دیر۔۔۔؟ مگر میں نے جلدی سے کچّی لسّی بنا ڈالی۔ روپا بھی جاگتی تھی۔ لپک کے باہر جو نکلی تو گلاس سے ٹکرائی۔ لسّی سے میرے کپڑے تر ہو گئے۔۔۔ پھر جو بچی تھی بھیج دی۔

میں تمہیں سچ کہتی ہوں، بالو کی ماں۔ رات تک یہ باپ اور دونوں بیٹے باہر نہیں نکلے۔ آپس ہی میں کچھ کھُسر پھُسر کرتے رہے۔ میں نے سوچ لیا۔ یا گھر سونے کی اینٹوں سے بھر گیا اور یا پھر سب کچھ بِک گیا۔ یہ ارنڈی چیز ہی ایسی ہے۔ اگر تم اسے دیکھو تو بالکل پتہ نہیں چلتا، کسی کی قسمت بنا سکتی ہے یا بگاڑ سکتی ہے۔ ہمارے دیس کی ارنڈی، توریے، مونگ پھلی میں وہ طاقت ہے، جو کسی دوسرے دیس کی دودھ بالائی میں نہیں۔ کسان ہل جوتتے ہیں، بیج بوتے ہیں۔ کارخانوں میں مجور محنت کرتے ہیں، لیکن ان کی قسمت کے فیصلے ان کمروں میں بیٹھے یہ سیٹھ لوگ کر ڈالتے ہیں، جو ہل چلانے میں نہیں، بونے میں نہیں، محنت مجوری کرنے میں نہیں۔

میں چاہتی تھی باہر آئیں تو آج ذرا ان سے دو باتیں کروں اور کہوں، پیسے کے پُجاریو! ایسی دُنیا بھی ہے جو پیسے کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتی۔ جیب سے پیسے نکال کر یوں پھینک دیتی ہے۔ مطلب کی چیز خرید لیتی ہے اور پھر چل دیتی ہے۔۔۔ آگے۔۔۔ دیکھو تو، تمہارے گھروں میں کیا ہو رہا ہے؟ مُہروں، سونے چاندی،

ہیرے جواہرات کی کھان میں تم نے ہم سب کو قید کر دیا ہے اور ہم بھوکوں مر رہی ہیں۔ ہیر جواہر تو نہیں کھا سکتیں؟

وہ نکلے۔۔۔ باپ اور دونو بیٹے۔ چہرے پر خوشی، نہ رنج۔ اور پھر گھر سے باہر چل دیے۔ ہم عورتیں ہکّا بکّا کھڑی رہ گئیں، سوچنے لگیں آج ارہر میں کچھ کالا کالا ہے۔ دِدّا آئی اور بولی۔ ارنڈی میں دس بارہ لاکھ کا گھاٹا پڑا ہے اور یہ لوگ دیوالے کے کاغذ لکھنے جا رہے ہیں۔ کل کچہری کھُلے گی تو داخل کر دیں گے۔۔۔

دیوالہ!۔۔۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو، بالو کی ماں؟۔۔۔ تمہارے لیے دیوالہ مر جانے کی بات ہے۔ ان سیٹھوں کے لیے نہیں۔ یہ تو جتنے دیوالے نکلیں، اتنے ہی امیر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے ہر دیوالے میں یہ کچھ اُوپر نیچے کر جاتے ہیں، جس سے لاکھ دو لاکھ کا فائدہ ہی ہوتا ہے، نقصان نہیں۔ اس سے پہلے میرا سسر اور اس کے بیٹے چار دیوالے نکال چکے تھے اور یہ پانچواں تھا!

رات بھر یہ ”مرد لوگ“ نہ آئے۔ دن بھر کچہری میں رہے۔ شام کو میں اسی

بخارچے میں بیٹھی تھی۔ سامنے اپنے سسر کو آتے دیکھا۔ کمر کی طنابیں ڈھیلی کرتے ہوئے۔ میرے جیٹھ کی موٹے شیشوں والی عینک ناک کی چونچ پر آگئی تھی اور یہ۔۔۔اُن کے منھ پہ تھوڑی اور کالک کھنڈ گئی تھی۔۔۔

دو سال تک انہوں نے رُوپا کا کچھ نہ کیا۔ میں نے پہلے اس بیچاری کے خیال سے صاف صاف کچھ نہ کہا۔ اشارے اشارے میں سب کہہ دیا مگر انہوں نے میری ایک نہ مانی۔ کوئی امیر گھر دیکھنے میں وقت ضائع کر دیا۔ روپا نے اتنے عرصے میں زمین آسمان تک کر دیا۔ اسے اب ہر آدمی مٹکی پھوڑ نظر آتا تھا۔ کب تک گلی محلے کی نظروں سے یہ بات چھُپی رہ سکتی تھی؟ آخر ایک دن تینوں باپ بیٹوں نے مل کر روپا کو خوب پیٹا۔ چھڑانے میں مجھے بھی پڑ گئیں۔ پھر انہوں نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

روپا کو تو کچھ زیادہ نہ محسوس ہوا، میں پاگل ہو گئی۔ اندر جاتی تو رو لیتی، باہر آتی تو رو دیتی۔ میں نے ساس کی منّتیں کیں۔ ددّا کے سامنے ماتھا رگڑا اور کہا۔ کیا یہ ضروری ہے؟ اچھا سا لڑکا دیکھو جو کھاتا کماتا ہو۔ باپ سیٹھ نہ ہو تو کسی اچھی نوکری

میں ہو، لیکن یہ کسی ایسے کی تلاش میں تھے جو ان ہی کی جات برادری کا ہو، جن سے بیوپار کا رشتہ بھی بڑھے۔ مگر ایسا کوئی نہ تھا۔ تھا بھی تو بڑی ناک والا۔ بہت پیسے مانگتا تھا۔۔۔لاکھ دولاکھ کی بھی بات نہیں۔۔۔پانچ لاکھ!

رُوپا کھل کھیلنے لگی۔ اس نے صاف کہہ دیا۔ شادی کروں گی تو اُسی مٹکی پھوڑ سے۔ مٹکی پھوڑ کا اصل نام شیتل داس تھا اور وہ آتشبازی کی دُکان کا مالک تھا۔ آمدنی کوئی اِتنی زیادہ نہ تھی لیکن دیوالی کے اِدھر اُدھر اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ سال بھر کے لیے کافی ہو۔ خود شیتل داس تھا مگر کام ہوائی پٹاخے کا۔ اپنا من شیتل ہو یا نہ ہو، لیکن دوسرے کا ضرور کر دیتا تھا۔۔۔ دیول نگری میں دو چار ہی بانکے تھے جن میں سے ایک وہ بھی تھا۔ ہر کھیل تماشے میں آگے، راس لیلا کا بندوبست اُس کے سپرد۔ وہ مہابھارت کا کنس تھا تو رامائن کا راون!

لیکن روپا اب اُسے نہ مل سکتی تھی۔ نہ اسے گوکل اشٹمی کے دن سانول داس کے دیول میں جانے کی اجازت تھی اور نہ راس لیلا، دسہرے میں حصّہ لینے کی چھٹی۔۔۔ مجھے تو اسے دیکھ دیکھ کر ترس آتا تھا۔ میرے دل میں جانے کیا کرانتی

کی لہر اُٹھی۔ شِو مندر جانے کے بہانے میں نے کپڑے وغیرہ پہنے اور چل نکلی۔ شیتل کی دُکان رادھا بازار اور رگھوناتھ بازار کے سنگم پہ تھی، جہاں مہابیر جی کا مندر ہے اور لال رنگ بکھرا رہتا ہے، ہر آتے جاتے کو لگتا ہے۔ کاربیوہار پہ آنے جانے والے لوگ وہاں تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، ہاتھ جوڑتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد زنجیروں کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹیوں کو بجاتے اور چل دیتے ہیں۔ سامنے، دائیں بائیں اور پیچھے گائیں بیٹھی جُگالی کرتی ہیں اور انہیں کوئی نہیں روکتا۔ کمیٹی بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ کوئی موٹر تانگے والا آتا ہے تو رُک جاتا ہے اور پھر گاڑیوں کو اِدھر اُدھر سے گھُما کر اپنا راستہ بناتا اور چل دیتا ہے۔

میں جا کر شیتل کی دُکان پر کھڑی ہو گئی۔ کئی لڑکے اُس کی دُکان پر کام کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے بالوں میں کنگھی کرتا اور لڑکوں کو موٹی موٹی گالیاں دیتا تھا۔ دسہرے کے اِدھر اُدھر کے دن تھے اور شیتل داس نے دُکان کے سامنے ایک طبیلے میں بانس اور کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ میگھ ناد اور بھبھیشن بن چکے

تھے اور اب روان بننے جا رہا تھا۔۔۔

مجھے سامنے دیکھ کر وہ بولا ۔۔۔ ''کیا چاہیے، پھل جھڑیاں؟ میں نے کہا۔ پھل جھڑی لینے نہیں آئی۔ دینے آئی ہوں۔''

وہ کچھ نہ سمجھا۔ دُکان سے نیچے اُتر آیا۔ میرا تن بدن کانپ اُٹھا۔ میں پرے مُنہ کر کے راون کے ڈھانچے کی طرف دیکھنے لگی، جس نے طبیلے کا تین چوتھائی گھیر رکھا تھا۔ دس سر لگنے والے تھے۔ وہ اور ادھر گدھے کا سر لگنے سے پورا طبیلہ گھِر سکتا تھا۔ میں نے جلدی جلدی شیتل داس کے سر کی طرف دیکھا۔ ہر سال سینکڑوں مٹکیاں پھوڑنے سے جس پہ چھوٹے چھوٹے زخموں کے نشان پڑ گئے تھے۔ پھر میں نے جو کہنا تھا چپکے سے کہہ دیا۔ شیتل داس کا چہرہ چمک اُٹھا اور میں چل دی۔

شام کو بھاٹ چلے آئے، جو ہر سال ہمارے گھر میں آلا اُودل سنایا کرتے تھے۔ اور جسے سُن کر ہمیں بڑا جوش آتا تھا۔ ان میں سے ایک تھا جو خنجری بجاتا تھا اور وہ شیتل تھا، چونکہ یہ سب لوگ گھر کے اندر تھے، اس لیے رُوپا انہیں دیکھ سکتی

تھی۔ شیتل کو دیکھتے ہی وہ کانپنے لگی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں منھ بھینچ کے ہنس دی۔

گھر بھر میں کوئی بھی شیتل کو نہ پہچان سکا۔ پڑوسنیں بھی اُسے نہ جان پائیں۔ کم بخت ایسا بہروپیا تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہوا۔ ایک پہچانا تو پہچاننے والی نے، جو اس کے ایک ایک بل سے واقف تھی۔ رُوپا اندر بھاگنے لگی۔ میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

میں کہتی ہوں بالو کی ماں۔ مجھے اس میں ذرا بھی لاج نہ لگی۔ اور نہ ایسا معلوم ہوا جیسے میں نے کوئی پاپ کیا ہے۔ اُلٹا یوں جان پڑا، جیسے کوئی بہت بڑے پُنّ کا کام کر رہی ہوں۔ ہمارے شاستر اس طرف تھے اور دڈّا، ساس، جیٹھانی، سسر، جیٹھ، یہ، وہ سب دوسری طرف۔۔۔ میں نے وقت کا ایسا بندوبست کیا تھا کہ ان کے آلا اُودل شروع کرنے سے ختم کرنے تک رات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا، عورتوں میں سے رُوپا غائب ہے اور مردوں سے شیتل۔ باقی کے بھاٹ تُلسی جی سے کچھ پڑھتے رہے۔۔۔

جب بہت دیر تک نہ آئے تو میں گھبرا گئی۔ اُٹھ کے گئی تو دیکھا، رُوپا اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی چھت کو تک رہی ہے۔ میں نے اشارے سے پوچھا۔۔۔ وہ کہاں گیا؟ رُوپا نے بتایا، پیچھے سیڑھیوں کے راستے سے غائب ہو گیا ہے۔ میں سمجھی بس مل لیا دونوں نے، اور کوئی بات نہیں ہوئی۔۔۔ مگر مجھے کیا پتہ۔ بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔۔۔؟

گھر کے مرد لوگ پیڑھی پر سے چلے آئے۔۔۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اس روز مجھے رُوپا کے بھیّا بُرے نہ لگے۔ انہیں خود بڑی حیرانی ہوئی کہ یہ آج اتنا پھُسلا کیوں رہی ہے؟ میں بڑی خوش تھی، جیسے مجھے، کچھ مل گیا ہے۔ مل بھی جاتا، بالو کی ماں تو اپنے آدمی کے لیے میرے دل میں پیار کم ہو جاتا؟ بالکل نہیں۔ اُلٹا بڑھتا ہی۔ میں سوچتی۔۔۔ میں کیا کر آئی ہوں۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم؟ جو لوگ عورت کو جنتی نہیں سمجھتے، بیوپار جائیداد کی چیز سمجھتے ہیں، جن کے دماغ میں شادی کا وہی پُرانا مہتّو گھُسا ہوا ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔ اُنہیں اس بات کی کیا سمجھ؟

رات دو بجے میں ہڑبڑا کے اٹھی۔ گھر بھر میں شور مچا ہوا تھا۔۔۔ روپا شیتل کے ساتھ دوڑ رہی تھی کہ پکڑی گئی۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ روپا سے ہر طرح کے سوال کیے جا رہے تھے، مگر اُس نے ایک ہی چُپ لگا رکھی تھی۔ وہ ڈھیٹ بن گئی تھی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ کر لو جو میرا کرنا ہے، میں تو وہی کروں گی جو میرے من میں ہے۔

ایک بات اچھی ہوئی جو شیتل نکل چکا تھا۔ اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلا۔ وہ ہوتا تو سب کہہ ڈالتا۔ اُسے کیا پڑی تھی؟ وہ تو رسیا تھا، باقی رہی روپا کی بات۔ روپا کو کوئی مار بھی دیتا تو میرا نام نہ لیتی۔ وہ اتنی ناشکری نہ تھی!

اب سب کو ہاتھ پیر پڑ گئے۔ اتفاق سے دوسرے ہی دن گھر کے نائی نے بالا گھاٹ میں ایک رشتہ بتا دیا۔ ایسے سیٹھ کا نام لیا جس کے چھ دیوالے نکل چکے تھے اور جو بنولوں کا بیوپار کرتا تھا۔۔۔ سب کچھ جلدی سے طے ہو گیا۔ رُوپا کو منانے کا کام میرے سپُرد کیا گیا۔ رُوپا کچھ نہ مانی کچھ نہ مانی اور دنوں ہی میں برات بھی دروازے پر آ گئی۔

میں نے لڑکا دیکھا تو میری طبیعت خوش ہو گئی۔ شیتل تو اس کے مقابلے میں کچھ نہ تھا۔ یہ جوان، خوبصورت، لمبا چوڑا۔ میں رُوپا کے پاس بھاگی گئی اور اُسے سب بتا دیا۔ رُوپا مُسکرا دی۔ ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ۔ میں تو ناچ اُٹھی جیسے رُوپا کی نہیں، میری شادی ہونے جا رہی ہے۔۔۔

تم نے تو وہ شادی دیکھی ہے، بالو کی ماں؟۔۔۔ وہ شادی دیول نگری میں یادگار رہے گی۔ ان کے پِتا نے وہی کیا جو ہماری جات برادری کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک لاکھ روپیہ لگا دیا۔ گھر میں کس نے نہیں کھایا؟ کون لاگ لے کے نہیں گیا؟ ہمیں وار کرنے، چھیڑنے کو پوری برات ملی اور پھر وہ۔۔۔ دُولہوں کا دُولھا۔ وہ ہنگامہ ہوا، وہ شور مچا کہ بس۔۔۔ بینڈ باجے، گانے، روشنیاں، میری جیٹھانی کے بچّے خوش تھے۔ میں نے بلرام کو بُلایا اور کہا۔۔۔ دیکھ ننّھے! تیری بُوا کی شادی ہو رہی ہے۔ اس بے چارے کو کیا پتہ، کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا؟ اور کیا ہونے جا رہا ہے؟ وہ خوش تھا۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا مہیسُو تھامے۔ اُس نے صرف اتنا سا کہا۔

”میں بھی شادی کروں گا، چاچی“!

میں نے کہا۔۔۔ ”کس سے؟“

بولا۔۔۔ ”بُوا سے۔“

”ہشت۔۔۔“ ددّا جو پاس کھڑی تھی، بولی۔۔۔

ڈولی گئی۔ وہ آتشبازی چھوٹی کہ رام رام۔ پانچ ہزار کا ٹھیکہ میں نے ان کو کہہ سُن کے شیتل کو دلوا دیا تھا اور وہ خود کھڑا اپنے سامنے چکّر چلوا رہا تھا جس میں سے سات رنگ کے پھول نکلتے تھے۔۔۔ ڈولی گئی! اب گھر میں ڈونوں، پتّلوں، کاغذ کے پھولوں، بیلوں، پھٹے ہوئے غُباروں، چلے ہوئے اناروں، چکّروں کے بانسوں، کانچ کے ٹکڑوں، فِرنی کی پلیٹوں کے سِوا کچھ نہ رہ گیا تھا۔ جتنا شور مچا تھا، اتنی ہی چُپ تھی۔۔۔

کہیں دو مہینے کے بعد رُوپا آئی۔ اُس کے چہرے کا رنگ ہی اَور تھا۔ لڑکے نے اُسے اور اُس نے لڑکے کو بے حد پسند کیا تھا۔ رُوپا کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ اب میں اس کے سامنے یہاں کی مٹکی پھوڑ کا نام لیتی تو رُوپا خود ہی منہ پہ ہاتھ رکھ

دیتی۔ میں نے رُوپا سے کہا۔ ”رُوپ! دیکھا۔۔۔ میں نہ کہتی تھی؟“ روپ بولی۔ ”اور تو کوئی بات نہیں بھابی۔۔۔ یہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر دبُّو بہت ہیں گھر میں۔ کمانے والے میرے سسر ہیں اور ان کے بڑے بھائی۔ اس لیے ہر چھوٹی بڑی بات کے لیے انہیں ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کے گھر کے بڑے ہم سے کچھ اور چاہتے ہیں۔۔۔“

”اور وہ تمہارے۔۔۔“ میں نے شرارت سے پوچھا۔

”وہ تو کچھ نہیں چاہتے، بَس۔۔۔“ رُوپا نے کہا اور میری طرف دیکھ کے ہنس دی اور بولی۔ ”بہت وہ کرو گی بھابی تو ماروں گی، ہاں“!

میں مارے خوشی کے رُو دی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا ہمیشہ کے لیے رونا پڑ جائے گا۔ ”ہائے، یہ مرد!۔۔۔ رُوپا چار مہینے سے یہیں ہے اور کوئی لینے والا نہیں آیا۔ وہ روپیہ مانگتے ہیں اور یہ دینے پہ تیار نہیں۔ رُوپا نے ٹھیک کہا تھا۔ لڑکا دَبّو ہے۔ بات اتنی ہے کہ اچھی شکل، جوانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک مرد کماؤ نہ ہو، بیکار

ہے!

انہی چند مہینوں میں رُوپا آدھی رہ گئی ہے۔ وہ بخار چ سے بھی نیچے نہیں جھانکتی، حالانکہ دوسرے تیسرے روز دیول نگری کا بانکا، شیتل آتشباز پیار کے گانے گاتا نکل جاتا ہے۔ کل سویرے میرے سسر آئے۔ بہت خفا معلوم ہوتے تھے۔ اُس نائی کو گالیاں دے رہے تھے جس نے یہ رشتہ کرایا۔ کہہ رہے تھے۔ ہم لڑکی کو کبھی نہ بھیجیں گے، چاہے ساری عمر گھر بیٹھی رہے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ رُوپا کے سسر کا تو ایک بھی دیوالہ نہیں نِکلا!

یوکلپٹس

بہت ہی مرا مرا سا دن تھا جب کہ نومبر کی وہ ٹھٹھری ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی۔ لمحے دھڑا دھڑ ایک دوسرے پر ڈھیر ہو رہے تھے اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں سے یوکلپٹس کا پیڑ پھوٹ کر نکلتا تھا۔

کُندن ایک اعصاب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھر لوٹی تھی۔ ایک ہاتھ میں اس نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دوسرے سے کتابیں، جو خام چمڑے کے فیتے میں کیریر پہ ڈھیلی ہو رہی تھیں۔ یہ کتابیں کُندن نے اسی شام فادر ولیم اسکول کی

لائبریری سے نکلوائی تھیں، جہاں وہ وائس پرنسپل تھی۔ قاعدے سے کندن کو گولی کی طرح سے بنگلے میں داخل ہونا چاہیے تھا، مگر پھاٹک کے اندر آتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح سرجُو کے پاس رُک گئی۔

سرجُو یوکلپٹس کے پیڑ کا نام تھا۔

یہ پیڑ کُندن نے تین سوا تین برس پہلے لگایا تھا، جب وہ نئی نئی وِسکونسن یونیورسٹی سے ٹیچنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی۔ جب یہاں کیتھولک چپلن فادر فشر رہا کرتا تھا اور جس نے بنگلہ کا آدھا حصّہ کماری کُندن کو دے رکھا تھا۔ پھر برس ایک کے بعد وہ مشن کا کام پورا کر کے امریکا چلا گیا اور کُندن نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بُلا لیا۔ سائیکل کو جنگلے کے سہارے رکھ کر کُندن سُرجُو کے پاس آ کر رُکی اور اوپر کی طرف دیکھنے لگی، جہاں پتے اب تک اندھیرے کا رنگ لے چکے تھے۔ البتہ نیچے کی سفید، ملائم اور برچی چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پیار سے اس پر ہاتھ پھیرنے ہی والی تھی کہ دوسری طرف برآمدے میں اسے اپنی جیلی فش ماں کا ہیولا سا نظر آیا۔ اُسی دم جھُک کر کُندن نے پیڑ کے

نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اُٹھا لیے اور ہاتھ میں مسل کر انہیں سُونگھنے اور لانبے لانبے سانس لینے لگی۔ جیسے اُسے زکام ہوا اور یوکلپٹس کی بُو تنفّس اور اس کے رگوں ریشوں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو۔ پھر ماں کی طرف منھ کرتے ہوئے کُندن تھوڑا کھسیائی۔

"میں تو سرجُو کو بڑھتے دیکھ بھی سکتی ہوں، ماں۔"

اور اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ماں کے چہرے میں سے پسینے کے باریک باریک قطرے رس رہے تھے، جیسے کورے گھڑے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے۔ دوپٹے سے ماں اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولی۔ "پودے دن کو نہیں، رات کو بڑھتے ہیں، کُندنا۔"

"کیوں۔ رات کو کیوں؟"

"اُتپتی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں۔"

اور پھر ماں چپ رہ گئی۔ کُندن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع بھی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی ایک پیڑ کے ساتھ اپنی بیٹی کی بیمار سی محبت کو دیکھ کر ماں اکثر پریشان ہو اُٹھتی ہے۔ سائیکل کو جنگلے پر سے اُٹھا کر کندن برآمدے میں پہنچی ہی تھی کہ ماں نے کہنا شروع کیا۔ "پھر کیا نہ وہی خلجگن لکھّی نے۔"

لکھّی کندن کی کرسچین نوکرانی تھی۔ کُندن نے وہیں رُکتے ہوئے کہا "کیا مطلب؟" اور پھر، جیسے اپنے آپ سمجھ گئی۔۔۔ شروع ہو گیا؟"

"ہاں"

"کب سے؟"

"جب سے پڑوس کے مالی سے تمہیں ٹیلی فون کرایا۔"

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ماں نیچے فرش ہی پر بیٹھ گئی، حالانکہ پاس ہی برآمدے میں ملاقاتیوں کے لیے رکھی ہوئی آدھے درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔ یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب کوئی مرنے والا ہو، یا مر چکا

ہو۔

ادھر لکھّی اپنے کوارٹر میں کراہ رہی تھی۔ اُدھر ماں گالیاں بکے جا رہی تھی۔ اس کی آخری گالی تھی۔۔۔ ''چھنار'' جبھی لکھّی کی چیخ سنائی دی تو ماں اور کُندن دونوں مُنہ اُٹھا کر اندھیرے میں دیکھنے لگیں، جیسے لکھّی سامنے تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہو۔ شاید۔۔۔ زہ کے درد میں مبتلا عورت کہیں بھی ہو، دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کُندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ماں۔''

''سُن رہی ہوں۔'' ماں نے اپنے بوڑھے، چرّخ چُوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اُٹھتے ہوئے کہا، اور گرتے گرتے بچی۔ ''مجھے بھی کان دیے ہیں پرماتما نے'' وہ بولی اور سچ مچ ہی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے دونوں ہاتھ کانوں کی طرف اُٹھا دیے۔

کیا جذبہ تھا کہ دوسری چیخ کے ساتھ ہی ماں بھی چلّا اُٹھی۔ ''مرتی ہے تو مر

جائے۔۔۔ کیوں نہیں دن کے وقت بتاتی رانڈ؟۔۔۔ پار سال بھی ایسے ہی کیا تھا۔"

ماں بولے بغیر بھی نہ رہ سکتی تھی۔۔۔ "کیسے خونو خون، ہو گئے تھے میرے ہاتھ پیر اور کپڑے جو نوچندی میں بنوائے تھے، تم نے پیسے بھیجے تھے۔۔۔ میں اس کے باپ کی دائی ہوں؟" پھر ماں کے پیر کوارٹر کی طرف اُٹھ گئے، پھر وہ لوٹ بھی آئے۔

چیخ جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دے رہی تھی مسلسل ہو گئی۔ کُندن کے پیٹ میں بھی جیسے کوئی آزار پیدا ہو گیا اور طنابیں سی کھنچنے لگیں۔ سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی۔ "تو سمجھتی کیوں نہیں ماں؟۔۔۔ وہ غریب ہے۔ پیسے والے سو دارُو کر سکتے ہیں۔۔۔"

اور کُندن آپ ہی کوارٹر کی طرف چل دی، جب ماں نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔۔۔ "کُندنا!" اور پھر کوارٹر کی طرف جاتے

ہوئے کہنے لگی۔ ”یہ کام تیرے ایسی کچی کنواری کا ہے؟“

ماں لکھّی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی اور اپنی اہمیت کو جتانا بھی۔ جاتے ہوئے وہ مُنہ میں کچھ بکے جا رہی تھی۔ صرف ایک یہ لفظ کُندن کے کان میں پڑا۔ ”چھنار۔۔۔“

کہیں سے کوئی چمگادڑ اُڑا اور ڈرائنگ روم کے اندر پیرابولا کی شکلیں پیدا کرتا ہوا سامنے پہاڑیوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اُڑ گیا، جس میں ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے بھنبٹ قطار در قطار اندر آ رہے تھے اور سو واٹ کے بجلی کے ہنڈے سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے۔ جب وہ گرتے تو پتہ بھی نہ چلتا۔ صرف دیکھنے سے یوں لگتا جیسے زمین اوپر کی طرف اُٹھ رہی ہے۔۔۔ اور لمحوں کا ایک ٹیلہ بن رہا ہے۔

کُندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ روشنی میں تو اُونچ نیچ سب نظر آتا ہے، مگر اندھیرا ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا کرتا ہے۔ صرف اس

کے عادی ہو جانے پر مصیبتوں کے ہلکے خاکے اور گہرے خاکے دکھائی دیتے ہیں، جو اس یکسانیت میں اور بھی تاکید کا عالم پیدا کر دیتے ہیں اور آدمی گھبرا کر کھڑکی چھوڑ دیتا ہے اور ایک بے پناہ حبس سے بچنے کے لیے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے۔

کُندن واپس آکر صوفے میں بیٹھی تو یوں معلوم ہوا جیسے صوفے کے بازو اوپر اُٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا۔۔۔ کُندن انتظار کرنے لگی۔

پہلے تو انتظار ٹِک ٹِک کرتا رہا، پھر وہاں کے کیتھولک مشن کے گرجے میں لگے ہوئے گھڑیال کی طرح بجنے لگا۔ چیخیں تھم چکی تھیں۔ شاید ماں کے پہنچ جانے سے لکھّی کا حوصلہ ہو گیا تھا، یا شاید بچّہ پیدا ہو گیا تھا۔۔۔ نہیں، بچہ اس دُنیا میں آتا تو ضرور روتا۔۔۔

۔۔۔ شاں ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑے۔۔۔ کُندن لکھّی کی کھولی تک جا پہنچی۔ لیکن سوائے ماں کے بڑبڑانے کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ وہ ضرور

گالیاں تھیں جنھوں نے اس سانحے کے پیش نظر بے شکل سا صوت اختیار کر لیا تھا۔ بیچ میں کُندن کو کَھٹ کَھٹ کی آواز سنائی دی، جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار مار کر توڑ رہا ہو۔ پھر لکھّی کے ہُونگنے کی آواز، جیسے اس نے افیون کھائی ہو اور اصل کی تائید اور نقل کی تردید کرنے کا جتن کر رہی ہو۔ کُندن نے اپنے بدن میں سے کوئی بجلی جھٹکی اور بنگلے کی طرف مُڑ آئی۔ راستے میں سرجُو کی طرف دیکھا تو اُسے ایک بچّہ دکھائی دیا، جس سے ڈر کر وہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔

تھوڑے حواس بجا ہوئے تو کُندن تپائی پر پڑی ہوئی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگی۔ ان پر کھڑکی میں سے آنے والے بے شمار لمحے بکھرے پڑے تھے، جن کے پَر جھُلسے ہوئے تھے اور بدن مردہ۔ کُندن نے اُوپر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا ۔۔۔ ”مرد، عورتوں کے بغیر۔۔۔“ اس نے کتاب کھولی، پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”عورتیں، مردوں کے بغیر“!

فادر ولیم اسکول کی وائس پرنسپل کماری کُندن ایم اے، ٹی ڈپ کے بنگلے میں تین

عورتیں تھیں اور تینوں ہی مردوں کے بغیر۔ پہلی ماں سُبھاشنی، جو اَب چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور بے شمار لمحے اس پر ڈھیر ہو کر تہیں جما چکے تھے۔ اس کا نام آج کل کی لڑکیوں کا سا تھا لیکن اب تک اس نام کی سب لڑکیاں بوڑھی ہو چکی تھی۔ نئے نام پُرانے ہو چکے تھے اور نئی طرز کے وضع نہ ہوئے تھے اور لوگ مجبور ہو کر پُرانے ناموں پر لوٹ آئے تھے، جیسے ۔۔۔ کُندن ۔۔۔ جو نام کبھی بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا۔ پچیس چھبیس برس کا، اور خوبصورت اور دمکتا ہوا۔ سُبھاشنی بدھوا تھی اور کُندن یتیم۔ اس نے تو باپ کا مُنہ بھی نہ دیکھا تھا اور زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہی تھی۔ ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی کہ ماں کے بیان کے مطابق، کُندنی کا باپ چل بسا تھا۔ اس صدی کے شروع میں جو پلیگ پھیلی تھی اس نے موت میں سچ اور جھوٹ کو برابر کر دیا تھا۔ عجیب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ اس لیے جب مشن میں فادر مائیکل آسمانی باپ کے بارے میں باتیں کرتا تو کُندن ہمیشہ سوچنے لگتی، وہ تو مر چکا ہے، کسی زمینی پلیگ میں اور جب اسے کہا جاتا آسمانی باپ لافانی ہے، وہ کسی پلیگ میں نہیں مر سکتا، تو وہ اسے ڈھونڈنے

کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جاتی، چاہے وہ کیتھولک چیپلن ہی کیوں نہ ہو، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کیتھولک پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے۔

کئی بار کُندن نے چچا، تاؤ اور ددھیال، کے بارے میں پوچھا، لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہہ دیا۔ سب مر کھپ گئے دوسری پلیگ میں۔۔۔ تیسری پلیگ کب آنے والی تھی؟ اور پھر ایکا ایکی متجسس نگاہیں کندن پر پھینکتی ہوئی ماں پوچھنے لگتی۔ ''تو کیوں پوچھتی ہے؟''

''ایسے ہی'' کُندن جواب دیتی اور پھر کہہ اُٹھتی۔ ''ماں! آج ٹیچر نے مجھے یہ ریشمی رومال دیا تھا، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔''

سُبھاشنی نے اپنا رنڈاپا، اپنے چچیرے بھائی امولک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا، جو امرتسر میں لاہول اور تبّت سے آئے ہوئے کُٹھ کا بیوپار کرتا تھا۔۔۔ کُٹھ جو مرتے ہوئے آدمی میں بھی ایک بار تو زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ وہ مرتا ضرور ہے لیکن

اس سے پہلے وصیت کر جاتا ہے۔ سُبھاشنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی بھتیجیاں اور بھتیجے کھلائے تھے اور اس کے عوض روکھے سوکھے ٹکڑے پائے تھے۔ اسی لیے کُندن کی لوریاں اس کے لیے بھجن ہو گئی تھیں۔۔۔ روکھا سوکھا رام کا ٹکڑا، سیٹھا کیا اور سلونا کیا۔۔۔ وہ بھابی کے پھٹے پُرانے پہنتی تھی، تو اکثر باہر نہ نکل سکتی تھی، کیوں کہ اس کا جسم جُوں کا تُوں بھرا ہوا تھا، حالانکہ بھابی کا خرچ کی وجہ سے چاند کی طرح سے گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ بھابی کے کپڑوں میں پھنس پھنسا کر سُبھاشنی برہنہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ایک جرم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے ٹھنڈے فرش پر سوتی تھی اور ایک رہبانیت سی اس کے جذبات پر چھائی رہتی، جس میں اُداسی بھری ایک تسلّی تھی۔ اسے اس حدت کا احساس ہی نہ تھا جو مرد کے ساتھ والی چارپائی پر سونے سے عورت کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ پھر سوتے میں کبھی تکیہ اور لحاف وغیرہ ہوتے تھے اور کبھی نہ ہوتے تھے۔ سوائے سردی کے موسم میں ان کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر، سبھاشنی سوتی ہی کہاں تھی؟ جاگتی بھی کہاں تھی؟ وہ تو خواب اور

بیداری کے اعراف میں روتی ہنستی رہتی اور بھجن اس کا سہارا ہوتے۔

جب نین سے نیند گنوائی، تکیہ لیف بچھونا کیا

آخر۔۔۔ سمجھ بوجھ کچھ سوچ پیارے، پیار کیا تو رونا کیا؟

بھابی کی گالیوں کو سُبھاشنی نے "گھی کی نالیں، سمجھا اور مار پیٹ، دھکوں کو پھولوں کی چھڑیاں، اور یوں کُندن کو پڑھایا۔ باقی وہ وظیفوں اور سرکاری گرانٹوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکا تک جا پہنچی۔ وہ خوب صورت تو تھی ہی، اس پر تعلیم نے اس کے حُسن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں بیسیوں شک تھے اور وسوسے۔ ایک عجیب سے ارتقا میں اس کی آنکھیں کانوں تک کھنچ آئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی ہے تو پیچھے بھی دکھائی دیتا ہو گا۔ یا وہ ایسے ہی دیکھتی رہتی تھی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ باپ نہ ہونے سے لڑکیوں کو کیسی کیسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔۔ اس کے باوجود بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا جس کے

بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مر جاتی مگر کُھڈّ نے اس کی زندگی بچالی، تاکہ وہ بڑی ہوکر یوکلپٹس کا پیڑ بو سکے۔ یہ سب ایک طرح سے اچھا ہی ہوا، ورنہ کُندن پڑھائی ہی کو شادی نہ سمجھتی۔

تیسری عورت لکھّی تھی۔ کرسچین۔ وہ تیس ایک برس کی تھی اور محنتی ہونے کی وجہ سے تندرست۔ اس کا اصل نام لکشمی رام داس تھا اور اس کے شوہر کا نام سِدّھو۔ مگر کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس کچھ یُوں چڑھا کہ پھر نہ مٹا اور لکھّی آج تک نہ بتا سکتی تھی کہ رام داس اس کے باپ کا نام تھا، یا کسی پہلے شوہر کا۔ کبھی وہ اسے شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا۔ اور پھر ایک ابتری کے عالم میں۔۔۔ ”میرے باپ کا بھی وہی نام تھا جو میرے مرد کا۔“

لکھّی کا یہ تیسرا مرد سِدّھو، وہاں سے اکاون باون میل دُور کسی کولئری میں کام کرتا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک دو بار آتا۔ جب اس کے کپڑے کویلے اور اس کی دھول سے اَٹے ہوتے اور چہرے پر سیاہیاں کِھنڈی ہوتیں۔ کچھ تو کویلے کی اور کچھ ایسے جرائم کی جن کا وہ بے اختیار مرتکب ہوتا، ان باتوں کے کارن وہ

آپ ہی اپنا ہم زاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتا تو نہایت ہی بد صورت دکھائی دیتا اور جب نہ آتا تو اس سے بھی زیادہ بد صورت۔۔۔

سِدّھو کا بھُوت بنگلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں سبھاشنی اور کُندن پنجے جھاڑ کر لکھّی کے پیچھے پڑ جاتیں۔

”کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا بیٹھتی ہے؟“

”جب وہ تیری ذمہ داری لیتا ہے، نہ تیرے بچّوں کی، اپنے۔۔۔؟“

”سب مرد ایک ہی رسّی سے پھانسی دیے جانے کے قابل ہیں۔“

”مرد۔۔۔“ لکھّی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ کبھی سب غلط اور کبھی سب ٹھیک معلوم ہونے لگتا۔۔۔ ”ہاں، ہاں، ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ سب مرد اس قابل ہیں کہ۔۔۔ میں ایک اور کر لوں گی، مگر نہیں۔۔۔ وہ بھی تو۔۔۔“ پھر وہ ایکا ایکی خفا ہو اُٹھتی اور اپنا ہاتھ جوگی کی طرف لے جاتی۔ اس کے بعد سِدّھو کا ہم زاد اس کی طرف آتا، نم آنکھیں لیے، ہاتھ جوڑے اور لکھّی کا ہاتھ جولی کی طرف

جانے لگتا۔ پھر وہ دیکھتی۔ جب تک سِدّھُو کا ہاتھ لکھّی کے بدن پر پڑتا اور لکھّی کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی، آنکھیں چڑھنے، بند ہونے لگتیں اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی ہے۔ اسے جب ہی پتہ چلتا جب اس کے پیٹ میں کیڑا رینگنے لگتا۔۔۔

کرسچین ہونے کے ناطے لکھّی میں صبر تھا اور شکر بھی۔ لیکن کُندن نہ کرسچین تھی نہ مسلمان اور نہ ہندو۔ وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ وہ سوچتی تھی۔۔۔ کیا بکواس ہے، بچّہ ہمیشہ عورت کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ ایک دن تو آئے گا جب چاند، زحل اور مشتری تک پہنچنے والے عورت کی سوچ بچار کے، افلاک پر پہنچیں گے اور مرد کے ہاں بھی بچہ ہونے کا سامان کریں گے۔ آخر سارا سلسلہ تقلّب ہی کا ہے نا۔۔۔ مگر ایسے میں تو داڑھی اُگ آئے گی۔۔۔!

ماں گرتے پڑتے چلی آئی۔ اس کے کالے بھُورے بال بھیگے ہونے پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ مُنہ پر، کچھ جھکے جھکے شانوں پر۔ اس نے کس قدر جلدی میں اپنے ہاتھ پیر خُون سے صاف کیے تھے، اس پر بھی بانات کی قمیص پر ایک چھچھڑا لگا ہوا تھا، جس کے بارے میں وہ نہ جانتی تھی۔ وہ گالیاں دے رہی

تھی، تیز تیز اور بے ربط، اس کی آخری گالی تھی۔۔۔ ”ایک اور لڑکی چلی آئی۔۔۔“

کُندن چونک کر اُٹھی۔ بچہ پیدا کر دینے کے بعد سنبھالنے کا کام کُندن کا تھا۔ جب وہ لکھّی کے کوارٹر کی طرف لپکی تو ماں کہہ رہی تھی۔ ”ایک لائسن (لائیسنس) لے لو، کُندنا!۔۔۔ اب کے وہ حرامی آیا، تو میں اُسے گولی ماردوں گی۔“

اور ماں سُبھاشنی اپنے تخیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور رو بھی رہی تھی، جیسے ہر عورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد خود رونے بیٹھ جاتی ہے۔۔۔

سُرجو لہراتا رہا۔ ہر صبح و شام اسکول جانے سے پہلے اور لوٹنے کے بعد کُندن اُس کے پاس رُکتی اور اس کی نرم سی چھال پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی۔۔۔ اور ماں سُبھاشنی دیکھتی، پُکارتی۔ ”کُندنا! اب آ بھی جا۔“

سُرجو اب بیس پچیس فٹ لمبا ہو گیا تھا۔ کہیں سولہ سترہ فٹ اُونچا جا کر تو اس کے

تنے پھوٹتے تھے اور پتے پھلیوں اور تموّوں کی طرح عموداً لٹکے رہتے، جس کے کارن دوپہر کے سمے جب سائے کی ضرورت ہوتی، تو سُرجُو بیکار ثابت ہوتا۔ البتہ پہلے اور پچھلے پہر جب چھاؤں یوں ہی بدن میں کپکپی پیدا کرتی، تب یہ بھی لانبے اور گھنیرے سائے پیدا کرنے لگتا اور لکھّی کی تینوں چاروں بیٹیاں ریل ریل کھیلتی ہوئی، ایک دوسرے کا فراک تھامے، نیچے سے ننگی پیڑ کے نیچے چلی آتیں۔ اس کی آخری بیٹی ریوڑی بھی۔۔۔ اپنا گول مٹول اور چتّی دار چہرہ لیے، جو پیڑ کے نیچے سے ریت کے لمحے اکٹھے کرنے لگتی۔

کُندن نے ماں کے کہنے پر بندوق کا لائسنس تو نہ لیا تھا، البتہ ایک اور بندوبست کیا تھا جو بندوق سے بھی مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ بندوق تو رات کے وقت بے کار بھی ثابت ہو سکتی ہے، لیکن وہ ہتھیار کبھی خالی نہیں جاتا۔ اس نے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتّا رکھ لیا تھا جس کا منھ خوفناک تھا اور جبڑے کالے، جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر لٹکی رہتی تھی۔ جیگوار بہت مُوڈی کتّا تھا۔ سِدّھو کو بنگلے میں آنے دینا تو کُجا، کندن کو بھی اندر آنے کے لیے اس سے اجازت لینا پڑتی

تھی۔

بچیوں سے جیگُوار البتہ مانوس ہو چکا تھا، کیوں کہ وہ چوبیس گھنٹے بنگلے میں رہتی تھیں۔

ایک دن لکھّی کو اُبکائیاں آنے لگیں اور بہت اِدھر اُدھر کی کرنے کے باوجود ماں کو پتہ چل گیا، اس کے پیٹ میں بچّہ ہے۔ وہ کیسے ہوا؟ لکھّی اس کا تسلّی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی سے بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی۔ ماں سُبھاشنی اور کُندن جانتی تھیں کہ ریوڑی کے بعد سِدّھُو بنگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ لکھّی نے چوری چھُپے کوئی اور مرد کر لیا، مگر لکھّی انکار کرتی تھی۔ وہ یہ بات بھی "سچ" کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا مُنہ بھی نہیں دیکھا۔

نہیں دیکھا تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟

بنگلے میں کہرام مچ گیا۔ لکھّی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور ماں بیٹی آپس میں

لڑنے لگیں۔ ماں اس کتیا کو باہر پھینکوا دینا چاہتی تھی، مگر کندن اِس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اِتنے ڈھیر سارے بچے لے کر وہ کہاں جائے؟ ماں نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی۔ کُندن نے بہت سمجھایا، پیروں پڑی، لیکن جب ماں باپ کی ہمسائی ہونے کو تیار نہ ہوئی تو کُندن نے صاف کہہ دیا۔۔۔ ''اچھّاماں تم جاؤتو جاؤ، میں لکھّی کو نہ نکالوں گی۔۔۔''

اس پر ماں خوب دھاڑیں مار کر روئی۔ ''یہ بیٹی میری۔۔۔ماں کا جاناسہ سکتی ہے، لیکن لکھّی کا نہیں۔ لکھّی اس کی کیا ہوتی ہے؟'' جبھی ماں کو بھابی کے ظلم یاد آئے اور اس نے بیٹی کے پیروں پر سر رکھ دیا اور سفید بالوں کا واسطہ دے کر معافی مانگ لی۔

لیکن پھر لکھّی سے وہی پوچھ گچھ شروع۔ ''سچ بتا، کہاں سے لائی ہے؟''

''کہیں سے نہیں'' لکھّی کہتی ''اگر میں نے پاپ کیا ہو تو خداوند یسوع میری چاروں بیٹیوں کو لے جائیں۔''

"بیٹیوں کا کیا ہے؟" ماں کہتی۔ "وہ تو ہر عورت چاہتی ہے۔"

کُندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کاٹ دیتی۔ "ماں۔۔۔"

ماں کُندن کی طرف دیکھتی۔۔۔

"میں بھی تیری بیٹی ہوں۔۔۔" کندن آنکھوں میں شکایتیں، حکایتیں لیے ہوئے ماں سے کہتی "تو چاہتی ہے، پرماتما مجھے لے جائیں؟"

ماں سُبھاشنی کُندن کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیتی، تاکہ وہ اس سے زیادہ اُشبھ اور اوگت والی بات نہ کہہ سکے اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی، کہتی ہوئی "کندنی" اور پھر "تو میری بات نہیں سمجھتی، میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں۔ میں بھی سوچتی ہوں میں کیوں اس سنسار میں چلی آئی؟ کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی؟"

اس بات کے مہینے ڈیڑھ کے بعد صبح کاذب کے قریب جیگُوار بہت غرّایا، بہت بھونکا لیکن وہ لوہے کی ایک موٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ برآمدے کے جس ستُون کے ساتھ اسے باندھا گیا تھا، اپنی جگہ سے ہل گیا مگر زنجیر نہ ٹوٹی۔ اس کے

یوں بے تحاشا بھونکنے سے ماں اور کندن نے لیمپ ہاتھ میں لے کر ایک دو بار باہر جھانکا بھی، مگر کچھ نہ دکھائی دینے پر خاموش ہو گئیں۔ صرف ماں نے اتنا کہا۔

"یہ جیگُوار کو آج۔۔۔ ہوا کیا ہے؟"

"جانے۔۔۔ بہت ہی بھونکا ہے۔"

"اُدھر ہی بھونکتا ہے، جس طرف سُرجُو ہے۔"

کُندن نے بھی ایک بار اُدھر دیکھ لیا، حالانکہ اندھی سی روشنی میں سُرجُو کی سفید چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کندن بولی "ہاں، ماں! جانوروں کو وہ سب دکھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے۔"

اور کندن نے پٹّے سے گھسیٹتے ہوئے جیگُوار کو اندر ڈرائنگ روم میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ہاں، اب سِدّھو آ بھی جاتا تو کیا بگڑتا؟

لیکن پو پھٹے جب منھ میں بُرش لیے، کاندھے پر تولیہ رکھے، نائٹ گون میں ملبوس

کُندن باتھ روم سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یوکلپٹس کے نیچے کوئی سفید سی چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے ٹھٹھکی اور پھر سنبھلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بیٹھا ہوا ہے اور دُعا پڑھ رہا ہے۔ جبھی ایک سفید فرغل پورے قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دُھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔۔۔

"کون ہے؟" کندن نے فرغل سے چند ہاتھ پر رُکتے ہوئے پُوچھا۔

فرغل نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف پچھم سے آنے والی ہوا سے وہ تھوڑا سا ہلا۔ کندن ایک قدم اور آگے بڑھی اور اپنی نظروں کے کیمرے کا پورا ڈایافرام کھولتے ہوئے ایک دم چِلّائی۔۔۔ "باب"!

پھر وہ برش، تولیہ وغیرہ پھینکتے ہوئے دونوں بازو پورے پھیلا کر باب کی طرف لپکی۔ باب جامد و ساکت کھڑا تھا۔ کُندن اس سے لپٹ گئی۔۔۔ "باب۔۔۔ باب۔۔۔"

باب کے ہاتھ فرغل میں تھے۔ وہ ساکت تھا۔ اس نے کہا بھی تو اتنا "Keep Away"

کُندن بھونچکی رہ کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی اور نگاہوں میں معمّے لیے بابی فشر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن صاف ہونے لگا تھا اور صبح مشرق کے پرتو میں اس کی آنکھوں کے نمناک کونے دکھائی دے رہے تھے اور چہرے پر گناہوں کے احساس، جو بہت سی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مرتے۔

کندن نے پوچھ ہی لیا۔ "امریکا سے کب آئے؟"

"رات" بابی فشر نے وہیں سے جواب دیا۔ "پین ایم سے۔۔۔ پھر مائیکل کی کار میں۔"

کُندن ایکا ایکی بھڑک اُٹھی۔ غصّے اور رقت میں ڈوبی آواز سے بولی "کیوں؟" کیوں آئے تم؟ کیا ضرورت تھی؟۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

بابی فشر جوں کا توں کھڑا رہا۔

کُندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آواز دی۔۔۔ ”جیگُوار۔۔۔“

جیگُوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا۔ اسے کوئی بُو آگئی تھی، اور وہ زنجیر تُڑاتُڑا کر باہر آنے، اس اجنبی کو کچا چبا جانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کُندن اسے کھول کر فادر فشر پر چھوڑ دینے کے لیے لپکی، لیکن پھر لوٹ آئی اور سامنے دکھائی دینے والی برف کی سِل پر یورش شروع کر دی۔ وہ سِلیں توڑ رہی تھی اور چلّا رہی تھی ”باب، باب، بولو، کچھ تو بولو۔۔۔“

کندن کا جسم ساتھ لگتے ہی فادر فشر کی پاکیزگی کے ہمالے اور اس کے وطن کے اینڈیز پگھلنے پسیجنے لگے۔ چند لمحے پہلے سردی میں ٹھٹھرنے والے دو جسموں پر کوئی لحاف سے چلے آئے، جنہیں اُتار، ایک طرف پھینک کر باب بولا ”پرے ہٹ جاؤ۔۔۔ تم عورتیں سمجھتی ہو، مردوں کے عصمت ہی نہیں ہوتی؟“

کُندن نے تھوڑا پیچھے ہٹ کر بابی کی روح میں جھانکا اور کانپتی ہوئی منت اور آہ و زاری پر اُتر آئی۔۔۔

”میں نے عورت ہو کر تمہیں معاف کر دیا، باب۔۔۔ اور تم۔۔۔“

”میرے اور تمہارے درمیان۔۔۔ میں عورت ہوں۔“

بابی اپنا آپ چھڑا کر، سینے پر کراس پیدا کرتا ہوا چل دیا اور کندن پھاٹک تک اس کے پیچھے بھاگتی، پکارتی گئی۔۔۔ ”باب۔۔۔ باب۔۔۔“

اور جب باب نہ پلٹا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی اور اسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر اُسے خیال آیا۔ شاید۔۔۔

اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا۔ ”فا۔۔۔ د۔۔۔ ر۔۔۔“ اور اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور ان کی سیاہ تہوں میں گرتی، جذب ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

ماں نے باب فشر کو نہ دیکھا تھا۔۔۔ ”بیٹا! تم کس سے باتیں کر رہی تھیں؟“ اس نے پوچھا؟

کُندن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پونچھ ڈالنے کی بیکار کوشش کی اور نیچے دیکھتی ہوئی بولی۔۔۔ ''اپنے آپ سے۔۔۔''

لکھّی پر اب تک سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ''سچ بتا، کون تھا؟''۔۔۔ یہ اچنبھے کی گانٹھ کہاں سے لائی؟''

''تم تو یہ مت پوچھو، ماں۔''

ماں ایکا ایکی ڈر گئی۔ اس نے بیٹی کے چہرے پر دیکھا اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

کُندن نے بالقصد چہرے پر ایک معصومیت لاتے ہوئے کہا ''ہم عورتیں ہیں۔۔۔ ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں ماں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ بچہ ہے۔۔۔؟''

''اگر پھر لڑکی ہو گئی تو؟''

”لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی؟“

”ہوتی ہے، مگر۔۔۔“

اور پھر سب باتیں ان چند سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جارہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے۔ جن کا وہ کبھی جواب دے گی اور کبھی نہ دے سکے گی اور دے گی بھی تو اس پر ہزاروں دباؤ ہوں گے۔۔۔ سماجی، اخلاقی۔۔۔ اور بچے کو کچھ پتہ نہ ہو گا اور ماں ڈری، سہمی رہے گی۔

گرجے میں لکھّی نے ”کنفیشن“ کیا تو ایک اور ہی صورت پیدا ہو گئی جس نے فادر مائیکل، فادر روبیلو، سسٹر سپیریئر اینجلا کو بھگدڑ میں ڈال دیا۔ بابی فشر ابھی تک یہیں تھا اور دم سادھے ہوئے باتیں سُن رہا تھا۔ لکھّی نے کہا۔۔۔ ”وہ خواب میں آیا تھا۔“

اس پر معاملہ اور ابتر ہو گیا۔ ”کون؟“ سسٹر اینجلا نے پوچھا۔

کُندن بھی وہیں تھی۔ اس نے لکھّی کی مدد کرنے کی کوشش کی ”سِدّھو؟“ اس

نے کہا مگر لکھّی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب اور بھی حیران ہو کر جواب کے منتظر ہو گئے۔ لکھّی نے اُچٹتی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکاتی ہوئی بولی۔۔۔ "رام داس۔"

کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس ہی کا نام تھا۔۔۔

لکھّی قسمیں لے رہی تھی جن پر کوئی یقین کرے تو مرے، نہ کرے تو بھی مرے۔

عشائے ربّانی کی یہ شرکت ختم ہوئی۔ حیران و پریشان کُندن نے سسٹر اینجلا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "خواب میں آیا تھا۔۔۔ کیا یہ ہو سکتا ہے سسٹر؟" سسٹر اینجلا نے خود بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک مُہمَل سا جواب دیا "کیوں نہیں؟۔۔۔ اگر سچ کہتی ہے، لکشمی رام داس"!

فرداً فرداً فادر روبیلو اور فادر مائیکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیے۔ گرجے سے باہر سلیٹ سے بنے ہوئے راستے پر کندن نے فادر فشر کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ "کیا یہ

ہو سکتا ہے؟"

فادر فشر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کُندن سے کہا "نہیں۔"

کُندن چونک گئی اور بولی "فادر۔۔۔ تم ایک کیتھولک پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے؟"

"نہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے۔۔۔ میرا خیال ہے، کہیں رات کے وقت سِدّھو چپکے سے چلا آیا ہو گا۔"

کُندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا۔ "اُپتی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں۔" مگر فادر فشر کو آخر حد تک پہنچانے کے لیے کندن بولی۔ "سِدّھو یا رام داس؟"

”سِدّھُو۔“

”رام داس کیوں نہیں؟“

”رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔۔۔اس کا کوئی وجود نہیں۔وہ تو صرف نام ہے رجسٹر میں۔“

”ہاں مگر“کندن نے ضِد کی ”آیا بھی تو لکھّی کو پتہ نہ چلا ہو گا؟“

”تم تو جانتی ہو“فادر فشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹالتے ہوئے کہا۔۔۔”پھر خواب کتنا گہرا ہو جاتا ہے۔۔۔“

کُندن جذبات سے معمور ہو گئی۔”باب“اس نے کہا۔”تم ایسا سمجھتے ہو، تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے؟ کیوں نہیں شادی۔۔۔“

باب فشر نے کندن کو وہیں روک دیا۔صرف اتنا کہہ کر۔۔۔”نہیں۔“

”تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے، باب؟ اس دُنیا کے سب دھندے کرتے

ہوئے آدمی پادری سے بھی بڑا ہو سکتا ہے، یسوع۔۔۔"

باب نے پھر ٹوک دیا۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں۔۔۔"

اور فادر فشر ایک ایک قدم سے دو دو سلیٹیں پھاندتا ہوا واپس گرجے میں چلا گیا۔ پھر مَیری کے حضور میں دعائیں کرنے، رات کو اپنے مجرّد بستر پر سونے اور روز آدھی رات کے وقت اُٹھ کر شیو بنانے اور پھر سو جانے۔ اس کے کچھ دن بعد فادر فشر ہمیشہ کے لیے میڈیسن، وسکونسن چلا گیا۔

اب کے زچگی کے سلسلے میں لکھّی کو بہت کڑی ہدایات تھیں، بلکہ کُندن نے ایک سستی مگر چُست چالاک سی دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا اور وہاں کے اسپتال کی بیڈز بعض وقت ارجنٹ کیس کے لیے بھی خالی نہ ہوتی تھیں۔ میٹر نٹی کا خرچ برداشت کرنے کی لکھّی میں ہمّت نہ تھی۔ کُندنی مدد کر سکتی تھی، مگر ایک حد تک۔

مگر لکھّی زچگی کے سلسلے میں کوئی بھی مصارف برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ ماں

سُبھاشنی نے سیخ پا ہو کر کہا۔ ”مر جائے گی، کمینی۔“

”ٹھیک ہے“ لکھّی نے گھڑا سا سر ہلا دیا۔ ”چھُٹی ہو جائے گی۔“

”یہ چھوکریوں کی لام کون سنبھالے گا؟“

”خدا، جس نے پیدا کیا۔“

”اُنہیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں؟“

”نہیں۔“

اور ناک ناک تک بھرے ہونے کے باوجود، شرارت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لکھّی مسکرا دی۔ اس کا مطلب تھا یہ خدا ہی ہے، جو عین وقت پر عقل پھرا دیتا ہے، کسی اپنے ہی کھیل کے لالچ میں۔

اور تو سب ٹھیک تھا لیکن چتّی دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی اور کندن کو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر رحم آتا تھا۔ وہ اب تک مکمل طور پر ماں کو اپنا

سمجھے ہوئے تھی۔ ماں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی اور ماں ہی اس کی روٹی۔ اسے کیا معلوم چند ہی دن کے بعد لکھّی اسے نہ پوچھے گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی، بلکہ دوسرے بچّے کے سلسلے میں اُلجھی ہونے کے کارن اسے وقت ہی نہ ہو گا اور اگر کہیں لڑکا پیدا ہو گیا، تو۔۔۔ نہیں، اس بنگلے کا قانون ٹوٹ جائے گا، یہ لکھّی جانتی تھی اور سُبھاشنی اور کندن بھی۔

دایا دن میں دو ایک چکر کاٹ جاتی تھی تاکہ لکھّی کے چہرے پر شکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے۔ اس کے ساتھ طے ہی یہ تھا کہ وقت نبھا گئی تو لکھّی کی تنخواہ سے دس روپے کاٹ کر اسے دیے جائیں گے اور میم صاحب، کُندن بیس روپے اپنی جیب سے دے گی اور ساتھ دھوتی بلاؤز یا فراک کا کپڑا۔ گیدرڈ اسکرٹ۔۔۔

ایک دن دوپہر کے قریب دایا آئی تو لکھّی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دایا کو خود بہت اچنبھا ہوا۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کی تھی جس پر کوئی ہنس سکے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد لکھّی پھر کھکھلا کر ہنس دی۔ دایا اس کا مُنہ دیکھنے

لگی اور ڈر گئی۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک کنٹری عورت بیٹھے بیٹھے پاگل ہو گئی تھی مگر وہ ہنسنے کے سوا اور کوئی بات ہی نہ کر سکتی تھی، لیکن لکھّی۔۔۔بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ دایا لکھّی کی ہنسی سے مایوس ہو گئی اور سوچتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی ہفتہ بھر کوئی خطرہ ہی نہیں۔

دایا کے جاتے ہی لکھّی رونے لگی۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی، جتنا وہ ہنسی تھی۔ وہ ایک ایسے جری پن سے جو عورت ہی کا حصّہ ہے، اپنے درد کو دباتی رہی، حتیٰ کہ شام کے سات بج گئے۔

کُندن اسکول سے لوٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ماں دال بینتی ہوئی رسوئی کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لیے آئی کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی۔

"یہ۔۔۔؟" ماں نے کہا۔

"لکھّی کی آواز۔۔۔" کندن بولی۔ اور پھر یہ دونوں اندھیرے میں لکھّی کے گھر کی

طرف دیکھنے لگیں۔

"ہائے سرب ناخوش" ماں نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا "دایہ تو کہہ گئی ہے، ہفتے بھر کوئی خطرہ نہیں۔۔۔" اس کے بعد اور ہو ہائے سنائی دینے لگیں۔ ماں سُبھاشنی کی بے نقط گالیوں کا تانتا بندھنے لگا۔ بیچ میں جیگوار کے بے تحاشا بھونکنے کی آواز شامل ہو گئی۔

لیکن ماں سُبھاشنی پھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور اس بات کے انتظار میں تھی کب یہ آواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کُندنا زندہ تو اس کُتیّا کو گھر سے جانے نہ دے گی، البتہ مُردہ نہ رکھ سکے گی۔ اس نے کُندن کو بھی روک لیا۔۔۔ "اگر تو جائے تو میرا مرا منھ دیکھے۔"

کُندن رُک گئی، لیکن اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا اور چیخیں سُن کر اس کے قدم دروازے کی طرف اُٹھے اور پھر ماں کے ڈر سے رُک گئے۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا، جو پتھر بنی بیٹھی تھی۔ اندر سے وہ کیوں اور کس

بات کے خوف سے کانپ رہی تھی؟ اس کا کُندن کو بھی اندازہ نہ تھا۔ شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں سے ریوڑی چلی آئی۔۔۔ روتی ہوئی، متوحش اور مادرزاد ننگی۔۔۔

کُندن سے نہ رہا گیا۔ وہ بولی۔ ”میں جاؤں گی۔۔۔“

”کندنا“ ماں نے آواز دی۔ ”میں کچھ کھالوں گی۔“

اس پر بھی کُندن نہ رُکی اور کوارٹروں کی طرف لپک گئی۔ ماں کو وہ دن یاد آیا، جب میں نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کندن اسے ہمیشہ کے لیے بھیج دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ آج اسے ماں کے مر جانے کی بھی پروانہ تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا کُندن کا اور للّھی کا؟ سُبھاشنی اُٹھی اور اپنی ”کچی کنواری“ بیٹی کو اس کریہہ منظر سے بچانے کے لیے ریوڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی۔

دو گھنٹے ماں بیٹی کُشتی کرتی رہیں تب کہیں نو ساڑھے نو بجے ولادت ہوئی۔

"حرامی" بچہ پیدا ہو گیا، لیکن مرا ہوا۔ وہ لڑکا تھا۔۔۔!

پیدائش کے فوراً بعد، لڑکے اور لڑکی تو کیا، زندگی اور موت سے بھی بے خبر لکھّی ایک میٹھی نیند سو گئی۔ ایسی نیند جو اس جانکاہی کے بعد ہی آتی ہے اور جس کا احساس مرد کو کبھی نہیں ہوتا۔ کُندن کو یاد آیا لکھّی نے ایک بار دُعا مانگی تھی۔۔۔ "خدایا! ایک بار، صرف ایک بار میں لڑکا پیدا کر کے دیکھ لوں، چاہے وہ مرا ہوا ہو۔"

رات کے اندھیرے میں حقیقت کی راہیں ٹٹولتی، گرتی پڑتی ہوئی کُندن مشن میں پہنچی، جہاں مقدّس مریم اور اس کے اور بھی مقدّس بچے کا آئیکون تھا، جس کے سامنے وہ دو زانو ہو گئی۔ وہ جو ایک کرسچن سے بہت بڑی تھی، دائیں بائیں طرف دو بڑی سی موم بتیاں کانپنے لگیں، جن سے آئیکون متحرک ہو گیا اور مقدّس ماں، بچّے کو گود میں لیے کندن پہ مُسکرانے اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ جبھی فادر مائیکل آیا اور کُندن کو مسیح کو بھیڑوں میں شامل ہوتے دیکھ کر مسکرا دیا، لیکن جبھی اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور اس نے بچّے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر

دیا کیونکہ وہ کرسچن ہوئے بغیر مر گیا تھا، شراب اور پانی کے ساتھ اس کا بپتسمہ نہ ہو سکا تھا۔۔۔

صبح کندن کو ایک اور ہی مسئلہ درپیش تھا۔ بچّہ کرسچن تھا اور نہ مُسلمان۔۔۔ نہ ہندو۔۔۔ کون اسے اپنے قبرستان میں دفنانے دے گا۔ شمشان میں جلانے دے گا۔ ہر کوئی یہی پوچھے گا۔۔۔ اس کے باپ کا نام کیا ہے؟

ماں نے بنگلے کے ایک کونے میں گڑھا کھود لیا، بچّے کو دفنانے کے لیے۔ لکھّی گھسٹتی ہوئی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک کھوکھا تھا جس میں مشنریوں کے لیے شراب آئی تھی اور جسے انہوں نے بپتسمے وغیرہ کے لیے استعمال کیا تھا۔ وہی کھوکھا بچّے کا تابوت بنا۔ کھوکھے میں بچّے کو ڈالنے سے پہلے لکھّی نے ماں سے کہا۔ "ماں۔۔۔! ایک بار، صرف ایک بار مجھے میرا بیٹا دے دے۔۔۔"

ماں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بچّے کو لکھّی کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ لکھّی نے بچّے کو گود میں لے لیا۔ اس کی طرف دیکھا اور ایکا ایکی جھک کر اس کے

لڑکے پن کو چُوم لیا۔ اور پھر اسے ماں کو لوٹاتے ہوئے بولی۔۔۔ ”لے ماں۔“

تابوت کو گڑھے میں اُتار کر اس پر مٹی ڈالی گئی تو وہ بھی لمحوں کا ایک ڈھیر، ایک ٹیلہ بن گیا۔ کندن۔۔۔ کندن کہاں تھی؟ تھوڑی ہی دیر میں وہ نیچے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں سُرجُو کا ایک بُوٹا تھا جسے وہ کہیں سے کھود لائی تھی۔

”یہ اس پر لگا دو، ماں“ وہ بولی۔

ماں نے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کھُرپی گر گئی۔ اُس نے ایک تیز سی نظر سے سُرجُو یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں، ایک جست کے ساتھ اپنی بیٹی سے لپٹ گئی۔ ماں بیٹی دونوں ایک مشترک غم میں رو رہی تھیں۔

سب باتوں سے فارغ ہو کر بنگلے کے برآمدے میں بیٹھتے ہوئے ماں نے کُندن سے کہا۔ ”بیٹا! جو ہوا سو ہوا، اب تو شادی کر لے۔“

کُندن ماں کی آنکھوں میں دھنستے ہوئے بولی۔ ”جب۔۔۔ تم نے کیوں نہ کی،

ماں؟"

"تم جو تھیں۔۔۔میرا سب کچھ" ماں نے جواب دیا اور نظریں بچا لیں۔

کُندن نے ماں کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بولی "ادھر میری طرف دیکھو، ماتی! میں شادی کروں گی!"